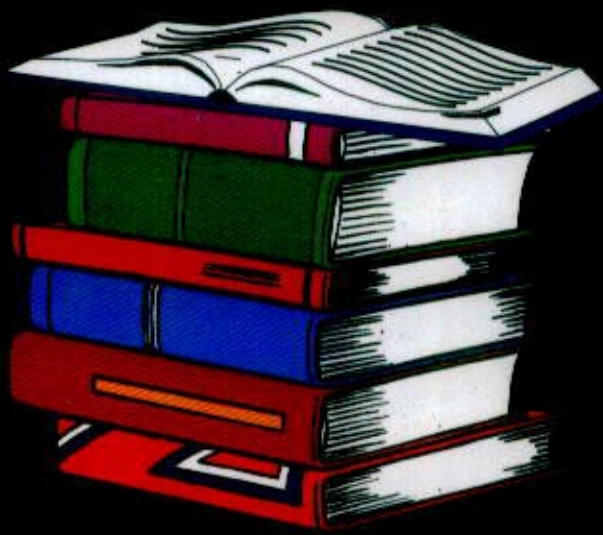
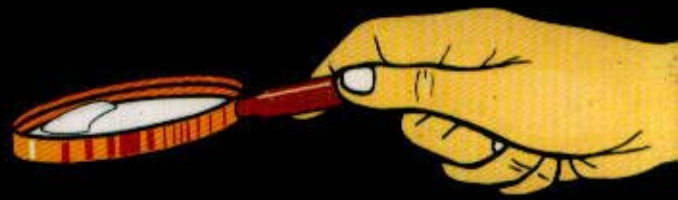


ادبی تجزیہ

(تحقیقی و تنقیدی مقالات)



ڈاکٹر قاسم جلال

فہرست

- ۷ قاسم جلال — ایک کامیاب محقق (ڈاکٹر نواز کلوش) ○
- اصناف سخن
- ۱۴ اردو غزل کا آغاز و ارتقاء ○
- ۳۷ اردو نظم کا تاریخی و فنی پس منظر ○
- ۴۷ اردو مرثیہ — ماضی و حل کے آئینے میں ○
- ۵۴ اردو قطعہ نگاری کے خدو و خل ○
- ۶۰ اردو افسانے میں علامت کا استعمال ○
- شخصیات
- ۶۵ رئیس امر وہوی کے مختصر و فنی کمالات ○
- ۸۲ شہاب دہلوی کی غزل کے عناصر ترکیبی ○
- ۸۷ عارف رحمانی کے فکری زاویے ○
- کتب
- ۹۳ ”قانون مکافات“ ایک منفرد علمی سوغات ○
- ۹۵ ”موج نور“ کا تجزیاتی مطالعہ ○
- ۱۰۱ جعفر بلوچ کی دو اہم تصنیفات کا مختصر جائزہ ○

قاسم جلال۔۔ ایک کامیاب محقق

تحقیق اور تنقید کے میدان میں وہ پیش رفت نہیں ہو سکی جو ادب کے صحت مند رجحانات کی نشاندہی کرتے ہوئے مستقبل کے امکانات کا احاطہ کر سکے۔ اردو میں یہ شعبہ اس لئے بھی پنپ نہیں سکا کہ یہ جان جو کھوں کا کام ہے اور پر خارو سنگلاخ رستوں کا انتخاب ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ پھر تحقیق و تنقید کے لئے مختلف زمانوں کے علمی و ادبی ورثے سے آگمی، زبانوں کی تاریخی اور تدریجی و ارتقائی مراحل سے آشنائی اور معاصر ادبی پس منظر و پیش منظر پر دسترس ہونا ضروری ہے۔ اردو گرد کے علاقوں میں مروج زبانوں کے اردو پر ہونے والے اثرات اور مغربی ادبی اقدار کی بدلتی ہوئی فکری اساس کے بارے میں جاننا بھی شرط ہے۔ لہذا ان گورکھ دھندوں میں جان کھپانا اور کسی تخلیق کی پرکھ کے لئے قدم اٹھانا دشوار کام ہے۔ عمیق مطالعہ استدلالی و منطقی طرز احساس اور دوسری زبانوں کے ادب کا تقابلی ادراک بہت ناگزیر ہوتا ہے۔ زمانے کی بدلتی اقدار، تحریکوں، فلسفوں اور نفسیاتی تئیرات سے آگمی کے بعد تخلیقی سمندر سے موتی نکالنا گہری شعوری مشقت کے باعث ہی ممکن ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی سے حسن عسکری تک اور وزیر آغا سے قاسم جلال تک اس دشت میں مٹی بھر دانٹھور اسالیب ادبی اصولوں اور معیارات کی راہیں متعین کرنے میں مصروف عمل ہیں۔

قاسم جلال کی زیر نظر کتاب ”ادبی تجزیے“ اصناف سخن کے ارتقائی سفر سے متعلق ہے۔ جبکہ اس کا کچھ حصہ شخصیات اور کتابوں کے تبصروں پر مشتمل ہے۔ قاسم جلال کئی مشق شاعر ہیں۔ ان کے شعری مجموعے پاکستان بھر میں پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ نثر کے میدان میں بھی انہیں انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ ان کا حفیظ جالندھری سے طویل انٹرویو کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے اور اردو ادبی تاریخ کا اثاثہ ہے جس میں حفیظ جالندھری کی زندگی کے کئی گوشے منور ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ قاسم جلال کے مضامین مختلف ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ تحقیق اور تنقید ان کے مزاج کا حصہ ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ادبی

تحقیقات کو اپنے مخصوص زاویہ نظر سے دیکھتے اور پرکتے ہیں۔

ادبی تجزیے، قاسم جلال کے ان تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا اولین مجموعہ ہے جس میں اصناف سخن کا تفصیلی ارتقائی جائزہ شامل ہے۔ اس سے قبل بھی اصناف شعر کا تاریخی اور تدریجی سفر مختلف کتابوں کی صورت میں شائع ہو چکا ہے لیکن اس کتاب کے مضامین میں قاسم جلال نے نہایت سادہ آسان اور عام فہم زبان میں ان اصناف کو پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر مبین چند نے اپنی کتاب ”تحقیق کافن“ میں تحقیق کے بارے میں لکھا ہے کہ تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے جس کے حروف ح ق ق ہیں اس کا مطلب ہے حق کو ثابت کرنا یا حق کی طرف پھیرنا، ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول تحقیق کے لغوی معنی کسی چیز یا شے کی حقیقت کا اثبات ہے اصطلاحاً یہ ایک ایسے مطالعے کا نام ہے جس میں موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔ تحقیق کے مختلف انداز ہیں جس میں تجرباتی، تاریخی، عملی، نظریاتی اور اطلاقی تحقیق شامل ہے۔ قاسم جلال نے ادبی تجزیے میں نظریاتی، تجرباتی اور کہیں تاثراتی تنقید کا سارا لے کر اصناف سخن کو اپنے طرز احساس سے سجایا ہے اور ادبی تاریخی کڑیوں کو مربوط کیا ہے۔

شعر صداقت اور حسن فطرت کا دلکش اظہار ہے۔ جس کی کئی ایک پر تیس ہیں یہ غزل، نظم، قصیدے، قطعے، رباعی اور مرثیے میں اکائی کو برقرار رکھتا ہے بلکہ زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے مربوط ہوتا ہے۔ غزل میں شعر ایک مکمل موضوع کو پیش کرتا ہے۔ دو مصرعوں میں شاعر مکمل مہارت سے اپنی بات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ فصاحت و بلاغت اور ابلاغ شعر کا حسن ہے۔ غم جاناں سے غم روزگار تک زندگی کے تمام اظہار اس میں مل سکتے ہیں۔ ڈاکٹر فرہان فتح پوری نے غزل کو بھرپور اظہار کا خوبصورت وسیلہ قرار دیا ہے۔ فارسی سے اردو زبان میں مروج ہونے والی اس صنف سخن نے شاہ جہاں، اورنگزیب سے لے کر عہد جدید تک بڑا کٹھن سفر کیا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے موضوعات، اظہار کے سانچے اور لفظیاتی نظام تبدیل ہوتے رہے ہیں لیکن نہایت حدت میں بھی غزل نے اپنی شناخت کو برقرار رکھا ہے اور عام و خاص میں مقبول رہی ہے۔

غزل کے موضوعات حسن و عشق، لب و رخسار، قد و قامت، زلف دراز اور مخمور آنکھوں سے

معمور ہیں۔ بار بار موضوعات کی تکرار نے غزل کے حسن کو ماند کیا تو ایک وقت ایسا بھی آیا جب محمد حسین آزاد، حالی اور کرمل ہارائیڈ نے جدید نظم کو اردو میں متعارف کرانے کا عزم کیا اور انجمن پنجاب کے زیر اہتمام نئی نظم کی بنیاد ڈالی۔ گو نظم غزل کا رد عمل تھی۔ اس نئے تجربے کو ادبی دنیا میں پذیرائی ملی تو نظم نے بہت جلد اپنی جڑیں مضبوط کر لیں۔ مظاہر فطرت، موسم، تہوار، میلے ٹھیلے اور عام موضوعات اس میں اظہار پانے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی غزل کے مقابلے میں نظم زیادہ توانا نظر آتی ہے کیونکہ اس میں شاعر کے لئے اظہار کی آسانیاں موجود ہیں اور فکری تنوع، نفسیاتی و معروضی کیفیات کو نظم میں بہتر طریقے سے ڈھلا جاسکتا ہے۔ جدید نظم میں حالی سے اقبال اور فیض سے اختر جعفری تک زندگی پوری آب و تاب کے ساتھ متحرک اور رواں دواں نظر آتی ہے نظم کے ارتقائی سفر کو اس کتاب میں ایک خاص نقطہ نظر سے جانچا گیا ہے۔ اردو مرثیہ اہل بیت اور امام حسینؑ کے ساتھ والہانہ عقیدت و احترام کا اظہار ہے۔ اس میں شاعر احتیاط کے ساتھ ایک ایک منظر کو قلم بند کرتا ہے۔ تمہید، جنگ کا منظر نامہ، جوش و جذبہ، لفظوں کی گھن گرج اور رواں بحروں کا استعمال اس کا وصف ہے۔ میر انیس اور میر دبیر سے لے کر محسن نقوی تک اردو مرثیے کے خداداد خیال، کس طرح سنورے، کس طرح ہیبت کی تبدیلیاں اس میں در آئیں اور اس نے کیسے اردو ادب میں اپنی شناخت کو زیادہ مربوط کیا؟ ان سوالات کے جوابات مضمون ”مرثیہ - ماضی و حال کے آئینے میں“ تفصیل کے ساتھ دے دیئے گئے ہیں اور اس بات کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ مختلف ادوار میں کس طرح شاعروں نے اسے مخصوص لب و لہجہ عطا کیا۔ ترقی کی منزلوں تک پہنچایا اور اس کے جواز کو ادب میں ثابت کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا شاعر کرلا کی علامتوں کو شعر کا پیراہن عطا کرتا نظر آتا ہے اور یہ استعارہ شاید اردو شاعری میں ہمیشہ تابندہ رہے گا۔ قطعہ نگاری میں شاعر انتہائی جا بگدستی سے چار مصرعوں میں ایک موضوع کے ساتھ انصاف کرتا ہے۔ اس میں عام طور پر معروضی حالات کو پیش کیا جاتا ہے۔ صحافت سے وابستہ ہو کر رئیس امر وہوی نے اردو قطعے کو ایک نیا آہنگ دیا ہے۔ انہوں نے عام انسانی جذبات کو نہایت عمدہ بندشوں سے قطعات کا روپ دیا ہے جس سے قطعہ نگاری کی تاریخ اردو ادب کا سرمایہ بن گئی ہے۔ عوامی احساسات اور جمہور کی خواہش اس میں مچلتی اور کوئٹھ لیتی ہیں۔ قطعہ نگاری کی تاریخ کو بھی مختلف ادوار میں قاسم جلال نے محفوظ کر لیا ہے۔ لوک کہانی سے داستان تک اور پھر ناول سے افسانے تک کہانی نے مختلف انداز

ہے اور یوں اپنے تحریر کو بوجھل، ثقیل اور غیر دلچسپ ہونے سے بچایا گیا ہے۔

میں قاسم جلال کو ان کے اولین تحقیقی و تنقیدی مجموعے ”ادبی تجزیے“ پر خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے ادب کے طالب علموں کے لئے بیش بہا معلومات کو اکٹھا کر کے شائع کر دیا ہے۔ اس سے جہاں ادب کے طالب علموں کو فائدہ پہنچے گا وہاں عام قاری کے لئے بھی بہت سی کام کی باتیں موجود ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ وہ آئندہ بھی اس کام کو جاری رکھیں گے کیونکہ آج کل تحقیق و تنقید کے میدان میں جس کا اشارہ میں نے شروع میں بھی کیا ہے جو کئی محسوس ہو رہی ہے وہ پوری ہوگی بلکہ جنوبی پنجاب سے ایک ایسا محقق اردو ادب کی تاریخ میں اپنا آپ منوا سکے گا۔ جس کی تحریروں میں استدلال، منطقی ربط اور متن میں استعمال ہونے والے لفظ اپنائیت کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ”رئیس امرہوی -- احوال و آثار“ جب چھپ کر سامنے آئے گا تو دنیائے ادب کو ایک ایسا محقق میسر آجائے گا جو اپنی ادبی خدمات کی بدولت آنے والوں کے لئے مینارہ نور ثابت ہوگا۔ انشاء اللہ

ڈاکٹر نواز کلوش

شعبہ اردو

گورنمنٹ ایس ای کلج

بہاول پور

سے سفر کیا ہے۔ افسانہ اردو نثر میں اہمیت کا حامل رہا ہے۔ ایک نشست میں پڑھی جانی والی کہانی نے اردو میں کس طرح اپنی جگہ بنا لی اور کن کن لکھنے والوں نے اسے اپنے اپنے انداز میں سپرد قلم کیا قاسم جلال نے وضاحت کے ساتھ اس کی تاریخ لکھ دی ہے بلکہ علامت نگاری نے افسانے کو کس طرح متاثر کیا۔ واقعات، تاثرات، نفسیات اور استعاراتی اسلوب افسانے کی کس طرح ضرورت بنا۔ یہ سب کچھ انہوں نے اس کتاب میں بیان کر دیا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں رئیس امرہوی، شہاب دہلوی اور عارف رحمانی کی شخصیات کا فکری و فنی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان شخصیات کی فنی خوبیاں، کمالات اور فکری نقطہ نظر اس طرح پیش کیا گیا ہے جس سے انہیں سمجھنے میں بہت آسانی ہوگئی ہے۔ بلکہ وہ بہت سے ایسے گوشے بھی ہمارے سامنے لائے ہیں جن سے ان شاعروں کی فکری اساس کو ایک نئی جت مل گئی ہے۔

کتاب کے آخری حصے میں مختلف کتابوں کے تجزیے اور تبصرے شامل کئے گئے ہیں۔ یوں یہ ادبی تجزیے معنوی و صوری اعتبار سے ادبی دستاویز بن گئے ہیں۔

میک کیرو (R.B. Mckerrow) انگریزی کا ایک بہت بڑا محقق گزرا ہے اس نے تحقیقی مضمون

کے پانچ حصوں کی نشاندہی کی ہے۔

- ۱- تمہید
- ۲- مسئلہ
- ۳- اس کا پھیلاؤ
- ۴- مواد کا مرتب کرنا
- ۵- خاتمہ

وہ کتاب ہے کہ ان پانچ حصوں میں سے اگر کوئی حصہ بھی کمزور ہوگا تو آپ کی تحقیق کلوش کامیاب نہ ہوگی۔ میک کیرو کی تعریف کو ہم جب قاسم جلال کی تحریروں پر منطبق کرتے ہیں تو ایک خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے عرق ریزی سے ایک ایک نقطے کو نہایت وضاحت اور تفصیل کے ساتھ کتاب میں پیش کر دیا ہے۔ یہی نہیں کہ وضاحت میں لفظیات اور جملوں کو خواہ مخواہ طوالت دے کر مضامین کو بوجھل کیا گیا ہو بلکہ ان کی کامیابی تو یہ ہے کہ نہایت کمال مہارت سے انہوں نے جامعیت کے ساتھ اختصار کو بھی ملحوظ رکھا

Kitaabiyat.blogspot.com

اصناف سخن

غزل نے قصیدے سے ہی جنم لیا ہے۔ وہ عربی قصیدے کے حوالے سے غزل کا پس منظر واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”جاہلیت کے بڑے شعرا کے ظہور کے وقت عربی شعر کی سب سے زیادہ منجھی ہوئی اور مقبول عام شکل قصیدہ تھی۔ بلحاظ مضمون قصیدے کے دو حقے خصوصیت سے نمایاں تھے، 'نسب اور مدح۔ نسب، عربی قصیدے کی اس عشقیہ تمہید کا نام تھا جس میں شاعر اپنے کوائفِ عشق سناتا اور اپنے جوشِ محبت اور آلامِ فراق کا ذکر کرتا ہے۔ یہی قصیدہ فتحِ ایران کے بعد اہل ایران کے حصے میں بھی آیا۔ ایران کے جو ہر شاعروں نے قصیدے کی صورت (من حیث صورت) بہت جلد پسند کر لی اور پھر غزل کی زمین میں اسی ہیئت شعری پر صدیوں تک اپنی شاعرانہ کاوشوں کو صرف کیا۔ اس طرح غزل اپنی اصل کے لحاظ سے قصیدے کی ہیئت میں عورتوں کا ذکر اور ان کے عشق کا بیان ہے۔ غزل کا یہ تصور بدلتا عربی قصیدے کے اس حصے سے ماخوذ ہے جسے نسب کا نام دیا جاتا ہے (۵)۔ نسب

کو فارسی میں تشبیب کہتے ہیں۔

نویں صدی عیسوی میں فارسی غزل گوئی کا آغاز ہوا۔ دسویں صدی کے نصف اول میں فارسی کے صاحبِ دیوان غزل گو رودکی نے قصیدے کی تشبیب کے عشقیہ اشعار کو الگ کر کے اسے ایک منفی شعر کے طور پر متعارف کرایا۔ اسی منفی شعر کو غزل کہتے ہیں۔

اردو غزل کا آغاز و ارتقاء

صدیوں سے اردو غزل کا سفر جاری ہے۔ یہ ہماری تہذیب کی آئینہ دار ہے اور ہماری تہذیب اس کی ترجمان۔ ”یہ ہماری شعر و شاعری کا بیش بہا سرمایہ ہے“ (۱)۔ اگرچہ اسے گہے گہے مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن یہ صنفِ شعر اپنے خصائص کی وجہ سے ہر دور کے عوام و خواص میں مقبول رہی ہے اور اس کی ہر دلعزیزی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

”غزل کے لغوی معنی عورتوں کے متعلق بات کرنے کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عورت ہمیشہ ہمیشہ سے دنیا میں انسان کی محبوب ترین چیز رہی ہے اور ہر دل و دماغ پر اس نے ہر دور میں گہرا اثر کیا ہے“ (۲)۔ نقادوں نے اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق غزل کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ اردو انسائیکلو پیڈیا کے مطابق ”ہرن شکاری کتوں سے زخمی ہو کر بوسے کے عالم میں جو صدائے دردناک بلند کرتا ہے اسے غزل کہتے ہیں“ (۳)۔ غزل کی ہیئت وہی ہے جس ہیئت میں قصیدہ لکھا جاتا ہے۔ اس کا مطلع، 'تخلص کا حامل مطلع' کاغذ، 'روئیف' وزن اور ہر شعر بہ اعتبار مضمون قصیدے کی طرح ہے۔ غزل عربی زبان کا لفظ ہے۔ ”عربی کی کل کائنات رجز، 'حدی' ایات، 'قصیدہ اور مریہ تھا“ (۴)۔ پروفیسر حمید احمد خاں کے خیال میں اردو

بقولِ حسرت موہانی:

شعر دراصل ہیں وہی حسرت

سننے ہی دل میں جو اتر جائیں

بقولِ شان الحق حقی ”اچھا شعر شرح سے بے نیاز ہوتا ہے خصوصاً غزل کا شعر کہ اس میں بات فوراً دل تک نہ پہنچے تو تاثیر آدھی رہ جاتی ہے“ (۷)۔ لیکن دوسرے کے دل تک اپنی بات پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ دل سے نکلی ہو یعنی خلوص دل سے کہی گئی ہو۔ ”ایک شاعر عام انسانوں سے مختلف اور برتر ہوتا ہے۔ اس کی یہ برتری دلِ گداختہ کے طفیل ہوتی ہے۔ اس سے شاعری یادِ دردِ مجبوری نمودار ہوتا ہے۔“ (۸)

غزل نے ہر دور کے تقاضوں کا ساتھ دیا ہے۔ اس کے دامن میں ہمہ نوع تجربات و روایات موجود ہیں۔ ان روایات میں فلسفیانہ گہرائیاں بھی ہیں اور سماجی رویوں کا عکس بھی۔ تاریخی واقعات بھی ہیں اور بحرانی حالات کا مدوجزر بھی۔ ”وہ حسن و عشق ہو یا تصوف، بہار و خزاں ہو یا زندان و صحرا، حیات و اخلاقیات ہو یا نفسیات کے بے شمار پہلو، سب غزل کے موضوع میں داخل ہیں“ (۹)۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

”اردو ادب میں داخلی شاعری کی بہترین مثال غزل ہے جو شاعری کی

دروں، بیانی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ غزل میں شاعر مختلف وارداتِ قلبیہ نظم کرتا

ہے۔ خوشی، غم، وصل، ہجر کی کیفیات دکھاتا ہے۔ حسنِ محبوب دیکھ کر

اس کے دل میں جو احساسات بیدار ہوتے ہیں، ان کی سچی تصویریں کھینچتا

ہے۔ اس کے علاوہ اخلاقی، تصوف اور فلسفے کی گتتیاں بھی سلجھاتا ہے۔

لیکن یہ ساری گفتگو وہ رمز و کنایہ میں کرتا ہے۔ اشارات اور رمزیت غزل

کی جان ہے۔ یہی چیز غزل کی شاعری میں تاثیر پیدا کرتی ہے“ (۱۰)

پروفیسر حمید احمد خاں فارسی غزل کا عہد بہ عہد ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”بارہویں اور تیرہویں صدی میں سنائی، عطار اور رومی نے غزل کی

علائقانہ بات چیت کو تصوف کے نئے کیف سے آشنا کیا۔ یہ ایک بڑا

ترقی پسندانہ قدم تھا جس کے لیے راج الوقت غزل کی زمین تیار نہ

تھی۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ خود سنائی کی غزل میں ایک قسم کی

غربت محسوس ہوتی ہے لیکن اس سے بھی زیادہ واضح یہ واقعہ ہے کہ

گیارہویں صدی میں جب فارسی کے پہلے بڑے صوفی شاعر شیخ ابو

سعید ابوالخیر کو کسی موزوں شعری ہیئت کی ضرورت پڑی تو انہوں نے

غزل کو نہیں چھیڑا۔ رباعی کو اختیار کیا۔ غزل میں تصوف کی آمیزش

سو برس بعد سنائی کے حصے میں آئی۔ پھر سعدی کی سلاست نے اس

نئی غزل کو قبول عام تک پہنچایا اور حافظ کے سرود المان نے چار دانگ

عالم میں ایک گونج پیدا کر دی۔ دو صدیاں اور گزریں تو صفوی عہد

کے شعراء نے فلسفہ و نفسیات کے مضامین بڑی خوبی سے غزل میں

بیان کیے۔ سترہویں صدی میں بعض خیال بند شعراء نے (جن کے

سرخیل مرزا عبدالقادر بیدل ہیں) عشق سے روگردانی کر کے علوم

عقلیہ کو بڑی شدت سے غزل کا موضوع قرار دیا۔“ (۶)

اردو متغزلین کے سامنے فارسی غزل کی روایات کے رنگارنگ نمونے موجود تھے۔ چنانچہ انہوں نے ان

روایات کو اردو غزل میں سمویا اور اپنی تہذیب و معاشرت کے نقوش اجاگر کیے۔

درومندی و دل سوئی غزل کی روایت کے بنیادی عناصر ہیں۔ ان کی موجودگی کلام کی تاثیر کو

دو آتش کر دیتی ہے۔ پرسوز غزل کے اشعار سننے میں دل میں اتر جاتے ہیں۔

بنایا۔ اردو زبان اس وقت سوائے ہندی دہروں اور بھاشا کے مضامین کے اور کسی قتل نہ تھی۔ انہوں نے اس میں فارسی ترکیبیں اور فارسی مضامین کو داخل کیا۔“ (۳۲)

ولی نے سادہ و فصیح انداز میں معاملاتِ حسن و عشق اور صوفیانہ افکار کو غزل کے سانچے میں ڈھلا۔ ان کی غزل کے موضوعات میں گہرا سماجی شعور نظر آتا ہے۔ ولی نے جدید تشبیہات و استعارات سے کلام کو مزین کیا اور شگفتہ و شیریں اسلوب اپنا کر اردو غزل کو نکھارنے اور سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ میر تقی میر نے اردو غزل کو نئی روایات سے شناسا کر کے ایک خاص معیار عطا کیا۔ ان سے پہلے غزل مشکل پسندی و صنعت گری تک محدود تھی۔ میر نے سادہ اسلوب اختیار کر کے غزل کو مقبول عوام و خاص کر دیا۔ سوز و گداز، طنز، ندرت، ادا اور نزاکتِ زہاں کلام میر کے وہ بنیادی اوصاف ہیں جن کی وجہ سے میر کو شہرت دوام حاصل ہوئی۔

میر کی غزل کی ایک خاص پہچان ان کی غم پسندی ہے۔ وہ چونکہ عمر بھر مصائب و مشکلات کا شکار رہے اس لیے ان کا کلام درد و غم کا ترجمان نظر آتا ہے۔ ”میر کا کلام ان کی اپنی زندگی اور عوام کی دکھی ہوئی زندگی کا نچوڑ ہے۔“ (۳۳)

میر نے غم انگیز و اعلیٰ کیفیات کے ساتھ اپنے زمانے کی سیاست و معاشرت کے نقوش واضح کیے۔ ذات کے غم کے ساتھ سیاسی انتشار اور سماجی خلفشار میر کو خون کے آنسو رلاتا تھا۔ ان کے بارے میں شیفتہ کی یہ رائے جی بر حقیقت ہے۔ ”صد آہ دردناک بہ تاثیریک مصرع او نیست۔“ (۳۴)

میر کی غم پسندی و درد مندی کے پس پردہ عوامی کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

”میر کی درد مندی کے سرچشمے ان کے خاندانی ماحول سے پھوٹے ہیں۔ چچا کا جنون اور والد کی مجذوبانہ سیرت، ان کا صوفیانہ طرز زندگی اور صبح و شام کی بے خودی اور استغراق۔ یہ موروثی موثرات ہیں۔ بے وقت

غزل کبھی ہمیں جلوہ مجاہدات کی سیر کراتی ہے، کبھی جملِ محبوب کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ کبھی مسائلِ حیات سے آگاہ کرتی ہے اور کبھی ہماری قوتِ متجددہ کو ان دیکھی دنیاؤں کی طرف جست لگانے پر مائل کرتی ہے۔ اس سارے عمل کے دوران میں اگرچہ وہ تمام عناصرِ حیات و کائنات کا جزوی تجزیہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے لیکن درحقیقت اس کی تنقید و تحلیل، بگھرے ہوئے اجزاء کو سمیٹنے اور ان کی اصل شناخت اجاگر کرنے کی ایک کوشش ہوتی ہے۔ ”غزل کی امتیازی خصوصیت تحلیلی مطالعہ نہیں بلکہ اجتماعی محاکمہ ہے اور اس ضمن میں غزل نے جس انداز سے شعر کے مختصر سے پیمانے میں بڑے بڑے مطالب کو سمیٹا ہے، شاعری کی کسی اور صنف کے بس کا روگ نہیں۔“ (۱۱)

غزل کے میدان میں تقریباً ہر بڑے، چھوٹے شاعر نے طبع آزمائی کی ہے۔ ان شعراء کی فہرست بہت طویل ہے۔ چند ایسے شعراء کے کلام کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے جو شہرت کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے اور جن کی وجہ سے غزل اردو شاعری کا سرمایہ افتخار بن گئی۔

امیر خسرو نے سب سے پہلے اردو غزل گوئی کا آغاز کیا۔ ان کے بعض مصرعوں کا نصف حصہ ہندی اور نصف حصہ فارسی میں ہے۔

محمد قلی قطب شاہ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ انہیں اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کی غزلوں پر فارسی کے اثرات کم ہیں اور ہندی کا رنگ زیادہ غالب ہے۔

حقیقت میں ولی کے ہاتھوں ہی اردو غزل کی باقاعدہ بنیاد پڑی۔ ان کا کلام فارسی اور ہندی روایات کا ایک حسین سنگم ہے۔ انہوں نے ان روایات کی پابندی و تنقیدی انداز میں نہیں کی بلکہ اپنی انفرادیتِ طبع

کو بھی نمایاں رکھا ہے۔ محمد حسین آزاد ولی کی غزل گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

”ولی نے اسے وہ زور بخشا کہ آج ہندی شاعری (اردو شاعری) نظم فارسی سے ایک قدم پیچھے نہیں۔ تمام بحرِ فارسی کی اردو میں لائے۔ شعر کو غزل اور قافیے کو ردیف سے سجایا۔ ردیف وار دیوان

میر اور سودا اگرچہ ایک ہی دور کے ہیں لیکن چونکہ دونوں کی طبائع مختلف تھیں اس لیے ان کے اخذ و قبول اور احساس و ادراک کے پیمانے بھی مختلف ہیں۔ سودا کی غزلوں میں زندگی کا تنوع اور رنگارنگی نظر آتی ہے۔ وہ میر کی طرح صرف بے ثباتی، دنیا، غم، ہجر، سوز و گداز، اور حسرت و یاس ہی کی بات نہیں کرتے بلکہ زندگی کی بدبستی کے ساتھ اس کے روشن اور شگفتہ پہلوؤں کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ ان کے موضوعات کی ہمہ گیری اور وسعت نے انہیں منفرد مقام عطا کیا ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین ان کے موضوعات و اسلوب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

”سودا کے شعر میں بندش نہایت چست ہے۔ معنویت اور درد کا حصہ بھی کم نہیں ہے۔ تاثر جسکی چاشنی اردو غزل کے لیے ضروری سمجھی گئی ہے اس میں بھی سودا نہایت ممتاز رتبہ رکھتے ہیں اور ان کے یہاں تشبیہ اور استعارے کبھی کبھی ایسی چیزوں سے پیدا کیے جاتے ہیں جو خاص لطف دے جاتے ہیں۔“ (۱۷)

میر و درد نے مسائلِ تصوف پیش کر کے اردو غزل کو فلسفیانہ رجحانات سے روشناس کیا۔ وہ چونکہ خود صوفی تھے اور ان کی زندگی تصوف و معرفت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی اس لیے ان کی غزل میں ان کے خلوص دل کی تاثر نظر آتی ہے۔

درد کی غزل کے موضوعات میں دنیا کی بے ثباتی، انسان کی فانی حیثیت، مقاصدِ حیات، فکرِ آخرت اور مسائلِ زندگی خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے تصوف اور سماجی حقائق کو جس سادگی و پرکاری سے تغزل کے سانچے میں ڈھالا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ درد کی غزل گوئی کے باری میں صفی مرتضیٰ لکھتے ہیں:

”درد کی شاعری میں صوفیانہ خیالات کی نمائندگی پائی جاتی ہے۔ جسکی وجہ سے وہ دوسرے غزل گو شعراء سے ممتاز ہو گئے ہیں۔ ان کا لب و لہجہ، ان کا انداز بیانیہ، ان کی دھیمی آواز دوسرے شعراء سے

تبی، اعزہ کی بے مہری، زمانے کی جفاکاری، بے روزگاری، فاقہ کشی، درپردہ کی خاک بگری اور دوسرے مصائب و آلام نے میر کے ذہن کو تقریباً ماؤف کر دیا تھا۔ زمانے نے میر کو قدم قدم پر ناقص ہونے، بے کس ہونے اور غیر ملل ہونے کا احساس دلایا۔“ (۱۵)

درج ذیل شعر سے میر کے کلام کے محرکات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

سودا بھی میر کے ہم عصر تھے۔ انہوں نے میر کی طرح جس دور میں آنکھ کھولی ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ سیاسی و معاشی لحاظ سے افراتفری کا عالم تھا۔ وابستگانِ اقتدار زوال کا شکار ہو کر مرتعِ عبرت بن گئے تھے۔ امن و سکون خواب و خیال ہو کر رہ گئے تھے۔ سودا جن امیروں کے زیر سایہ زندگی بسر کر رہے تھے انہیں کبھی سیاسی استحکام نہ مل سکا۔ ان حالات میں سودا کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ ان کا درج ذیل شعر ان کے حالِ دل کا ترجمان ہے۔

تم کو معلوم ہے یارو! چمنِ قدرت میں
عمر گزری کہ ہے گردش سے سروکار مجھے

سودا کی زندگی کے نقوش ان کے کلام سے نمایاں ہیں۔ بقول شیخ چاند:

”جب ہم سودا کی غزلوں میں اس کی حیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس کے اندرونی رخ کا نقشہ دکھائی دیتا ہے۔ گو اس نے غزل کے مضامین میں بیرونی اور خارجی عناصر بھی داخل کر دیے ہیں۔ لیکن اس سے اس کی حیات کی ترجمانی کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ ہمیں اس کے دل و دماغ کی آواز متنوع مضامین و موضوعات کے ہجوم میں بھی صاف سنائی دیتی ہے۔“ (۱۶)

مختلف ہے۔ دلی کے سماجی حالات اور اپنے عصر کے احساسات کی

تصویریں بھی ان کے کلام میں ملتی ہیں۔“ (۱۸)

درد کی غزل میں حقیقی عشق کے ساتھ مجازی عشق کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ نسوانی حسن کی تصویر کشی کرتے ہوئے انہوں نے غزل کے اسی انداز کو پیش نظر رکھا ہے جو اس وقت دوسرے شعراء کے ہاں مروج تھا۔

”جس طرح درد کے متصوفانہ اشعار کو سامنے رکھ کر ان کو صوفی شاعر قرار دیا گیا ہے اسی طرح ان کے مندرجہ ذیل اشعار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ عشقِ مجازی کے ذائقے سے بھی بخوبی واقف تھے۔“

ان لبوں نے نہ کی میجائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

دل کس کی چشمِ مست کا سرشار ہو گیا
کس کی نظر لگی کہ یہ بیمار ہو گیا

قلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا

پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا“ (۱۹)

”معاملہ بندی“ انشاء، جرات اور رنگین کے کلام میں روحِ رومن کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان دونوں شعراء نے مسلسل غزلوں کے حوالے سے نام پیدا کیا ہے۔ ان کے کلام میں شوخی، با تکپن،

خود رفتگی، خواہش پرستی، ابتذال، رندی اور سرمستی پائی جاتی ہے۔ بقول سید اعجاز حسین:

”جرات و انشاء کی وجہ سے غزل کے رجحان میں یہ تبدیلی ہوئی کہ

بجائے متانت و بلندیِ تخیل کے چھینر چھاز اور شوخی زیادہ آگئی۔“

قنوطیت کم ہوئی۔ مگر کیف و دریا اثر کو صدمہ پہنچا۔ زبان و مذاق کی

بلند ہوتی ہوئی سطح کو کسی قدر نیچے آنا پڑا۔“ (۲۰)

کسی دانشور نے کہا ہے کہ کلامِ شاعر کی شخصیت کا ترجمان ہوتا ہے۔ اردو کے معروف غزل گو شاعر خواجہ حیدر علی آتش کے حوالے سے یہ مقولہ سو فیصد درست لگتا ہے۔ آتش کی تصوف سے دل بستگی صرف شاعری کی حد تک نہ تھی بلکہ ان کا اندازِ زندگی، رجحانِ طبع، عقائد اور افکار تصوف و معرفت کا آئینہ تھے۔ ان کی پوری زندگی قناعت، سادگی اور درویشی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔

زبان کی صفائی، رنگین، شوخی اور حلاوت نے ان کی غزل کو امتیازی خصوصیات عطا کیں اور ان کا اردو کے بہترین شعراء میں شمار ہوا۔

احشام حسین، آتش کی غزل کے موضوعات کے بارے میں لکھتے ہیں:

”آتش کے صوفیانہ تصورات کی نمود سب سے زیادہ تو ان کی آرزوگی

پندی، تسنید، قلب اور رومانی سرمستی میں ہوتی ہے جس سے ان کی

شاعری بھری پزی ہے لیکن تصوف کے وہ مقالت بھی ان کے یہاں

آتے ہیں جن کا تعلق معرفتِ نفس، فنائے خودی، ترکِ دنیا و وحدتِ

وجود، مجاز و حقیقت، جبر و اختیار، انسانی ہستی کی بے ثباتی، عظمتِ ترکِ

رسوم اور خدا کے متعلق شوخیِ تخیل سے ہے۔ یہی وہ کسوٹیاں ہیں

جن پر آتش کا تصوف پرکھا جاسکتا ہے اور انہیں اہم مسائل کی تشریح

اور توضیح سے تصوف کی حدود متعین کرنا جاسکتی ہیں۔“ (۲۱)

مرزا اسد اللہ خاں غالب اپنے عہد کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ ان کی غزل میں معاملاتِ حسن و عشق بھی ہیں، مسائلِ تصوف بھی ہیں اور حیات و کائنات کے پراسرار حقائق بھی۔ خصوصاً ان کے کلام میں ان کے عہد کے ذہنی و جذباتی رویے بہ تمام و کمال موجود نظر آتے ہیں۔ ”غالب ایسے دور میں پیدا

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے قول کے مطابق:

” غالب نے اردو غزل کو ایک نیا شعور، ایک نیا نسب اور ایک نیا افق

دیا۔ غالب کے تصرف سے غزل اردو کی تاثیر اور تقدیر بن گئی۔“ (۲۴)

پیام شاجہاں پوری غالب کی ندرتِ فکر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

” غالب اردو زبان کا عظیم شاعر تھا، جس نے عام راستے اور رجحان سے

ہٹ کر اپنے لیے ایک نیا جاہد بنایا۔ اردو کو نئے نئے اسلوب دیے۔

خیالات کو رفعت بخشی اور اچھوتے مضامین داخل کر کے اردو شاعری

کے سرمائے میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔“ (۲۵)

غالب ہی کے دور کے ایک اہم شاعر مومن خاں مومن ہیں جن کا اردو غزل میں ایک ممتاز مقام

ہے۔ دیگر شعراء کی طرح ان کی غزلوں میں مضامین کا تنوع موجود نہیں۔ تصوف، فلسفے اور تہذیبی مظاہر

سے کم نہیں کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ ان کی غزل کا زیادہ تر موضوع مجازی عشق ہے۔ انہوں نے معاملات

حسن و عشق کے حوالے سے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کو دلکش اور رنگارنگ اسلوب میں پیش کیا ہے۔

ان کا محبوب روایتی محبوب کی طرح کوئی آسمانی مخلوق نہیں بلکہ اسی دنیا کا گوشت پوست کا انسان ہے۔ تغزل

اور احساسِ جمال نے ان کی غزل میں طلسمی جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ ذاکر عبادت بریلوی مومن کی غزل کی

خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

” حسن کی رنگینیاں اور بجز وہ سال کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے مومن

نے انسانی شعور اور حقیقت پسندانہ زاویہ نظر سے کام لیا ہے۔ چنانچہ

ان کے یہاں نہ تو عشق کی خوشگلی کا تذکرہ حد سے زیادہ ملتا ہے اور نہ

لذت اور تفریح کی باتیں حد سے تجاوز کرتی نظر آتی ہیں۔“ (۲۶)

ہوئے جب ایک تہذیب کے لغزش آہستہ آہستہ دھندلا رہے تھے اور دوسری تہذیب انہی دھندلکوں میں اپنے قدم جما رہی تھی۔ غالب نے اسی کشمکش اور انتشار کا مطالعہ بڑی سنجیدگی اور نہایت دور اندیشی سے کیا اور اس سے بہت کچھ حاصل کیا۔“ (۲۴)

غالب کی غزل کو سیاسی و تہذیبی پس منظر میں دیکھیں تو اس میں مغلیہ سلطنت کے زوال کی تصویر بھی نظر آتی ہے اور داخلی انتشار و اضطراب کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ انہوں نے غمِ جانناں و غمِ دوراں کی فلسفیانہ توجیہ کر کے غزل کو جدید و مجتہدانہ رنگ عطا کیا۔ وہ منزلِ شوق کے ایسے مسافر ہیں جو حقائق کو کشادہ دلی سے تسلیم کرتا ہے اور کسی خوش فہمی و خود فریبی کا شکار نہیں۔ اس مسافر کو منزل ملے یا نہ ملے وہ اپنا سفر بڑے عزم اور ولولے سے جاری رکھتا ہے۔ شبیبہ الحسن اس سفر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

” غالب کے ذوقِ سفر میں فرزاگی بھی ہے اور دیوانگی بھی۔ اسی لیے

نہ وہ منزل پر پہنچتے اور نہ پیچھے لوٹتے ہیں۔ انہیں وہ یک گونہ بے

خودی حاصل ہو گئی تھی جسکی وجہ سے وہ اسی روِ وادیٰ خیال کو مستانہ

طے کر سکتے تھے جس میں نہ منزل آتی ہے اور نہ پسپائی ہوتی ہے۔

مستانہ طے کروں میں روِ وادیٰ خیال

تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے (۲۳)

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ غالب کی کوئی منزل مقصود نہیں یا وہ بے سمتی کا شکار ہیں۔ حیات و

کائنات کے بارے میں ان کا ایک مخصوص نقطہ نظر ہے۔ اس سلسلے میں ان کے اپنے تجربات و مشاہدات

ان کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ وہ روایت کو جدت اور تغزل کو تنقیر سے ہم آہنگ کر کے ایک ایسی فضا

تخلیق کرتے ہیں جس میں کیرانہ فکر اور سماجی شعور پرورش پاتا ہے۔

نظر میں: ”عشق و عاشقی ان کے لیے ایک سنجیدہ، متین یا مہذب طرز عمل نہیں بلکہ کھل کھیلنے اور چسکے کی چیز ہے۔ انہیں نہ احرامِ عشق ہے اور نہ پاسِ محبوب۔“ (۲۸)

اختر اور شوخی، داغ کی غزل کے اسلوب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

”داغ کی غزل کے لب و لہجہ میں جوش، تازگی، چمک اور لہک پائی جاتی ہے۔ اس کی خوش گفتاری میں ظرافت کے مختلف رنگ ملتے ہیں۔ مزاح، طنز، طعنہ، چٹکی، گدگدی، پھیبتی کے رنگ۔ داغ کے یہاں عشق بازی کی رنگینی، مستی اور انبساط ہے۔ اس کی زندانہ شوخی کی ترنگ مزے دار ہوتی ہے۔ داغ کی زباندانی اس کے لب و لہجہ میں تنوع اور پختگی پیدا کرتی ہے۔ وہ بڑی نفاست سے بیان کی نوک پلک درست کرتا ہے۔ محاوروں کا استعمال بڑے سلیقے اور قرینے کا ہوتا ہے۔ وہ بڑا فقرہ باز اور شیوہ بیان ہے۔“ (۲۹)

الطاف حسین حالی نے اگرچہ ابتدائی دور میں غزل کے روایتی انداز میں غزلیں لکھی تھیں لیکن انہوں نے جلد ہی یہ محسوس کر لیا کہ ایسی شاعری ملک و قوم کے لیے کسی صورت بھی سودمند نہیں۔ بلکہ یہ قوم کے اخلاق، نگارنے کا باعث بن رہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے غزل کے فرسودہ و پاپال راستوں پر چلنے کی بجائے نئی منزلوں کی طرف پیش قدمی کی۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

”حالی نے غزل کی خراب حالت کو محسوس کیا۔ غزل ایک خاص ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے مبتذل، مخرب اخلاق اور اصلیت و حقیقت سے دور ہو گئی تھی۔ انہوں نے اس کو چھپچھورے جذبات اور لائینی احساسات سے دور رکھنے کی طرف توجہ دلائی۔“ (۳۰)

بلور شاہ ظفر کی غزلوں کے موضوعات متنوع ہیں۔ اگرچہ ان کے کلام میں رطب و یابس بھی بہت ہے لیکن بہت سی غزلوں میں اردو شاعری کی پختہ روایات کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں اگرچہ سیاسی، تہذیبی اور عمرانی مضامین بھی ملتے ہیں لیکن بنیادی طور پر حسن و عشق کی کیفیات کی ترجمانی ہی ان کی شناخت ہے۔ ظفر کی زندگی چونکہ اہم انگیز واقعات سے معمور ہے اس لیے انہوں نے اپنی ذہنی و جذباتی کیفیات کو غزل کا روپ دیا جس سے کلام میں تاثیر کا جو ہر پیدا ہوا۔ ڈاکٹر جمیل جاہلی نے ظفر کی غزل کا جائزہ ان الفاظ میں لیا ہے:

”ظفر لفظوں کو سیتے سے استعمال کرتا ہے جس سے اندازِ بیاں میں گھاٹوں، معصومیت اور دھیما پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے لہجے میں بڑے ضبط اور توازن کا احساس ہوتا ہے۔ غم کی لپک اور لہجے کی کھٹک اس کی ہر غزل میں ایک فضا پیدا کر دیتی ہے، جس سے احساس و ادراک ایک رشتے میں پیوست ہو جاتے ہیں اور غزلیں تسلسلِ فکر و فضا کا احساس پیدا کرنے لگتی ہیں۔ زندگی کا تضاد، ماضی کی یادیں، لاشعور کا کرب، غمِ زمانہ، ذہنی بے چارگی۔ یہ اور بہت سے احساس پھاڑوں کے توازن کی طرح اسکی غزلوں میں نظر آتے ہیں۔ اس کے احساس کا بھولا پن، اس کی خودداری اور پاسِ آبرو قدم قدم پر دلوں کو موہ لیتے ہیں۔“ (۳۱)

نواب مرزا خاں داغ اگرچہ مومن، بلور شاہ ظفر، غالب اور ذوق کی آنکھیں دیکھ چکے تھے لیکن انہوں نے اردو غزل کی تمام روایات سے استفادہ کیا اور اپنا ایک مخصوص رنگ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس رنگ میں بیک وقت دلی اور لکھنؤ کی شعری خصوصیات موجود ہیں۔ عشق کا جنسی و جسمانی تصور ان کی غزل کا اساسی جزو ہے۔ اسی لیے ان کے کلام میں شوخی و عریانی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی

کلام میں تہذیب و معاشرت اور سماجی اقدار کی بھی خوب عکاسی کی ہے۔ ”حسرت کی شاعری میں صداقت‘ توانائی‘ جذبات نگاری اور سادگی مزاج کی وجہ سے اندازِ بیاں کی جو خصوصیتیں پیدا ہوئی ہیں وہ فلسفہ و فکر کی گہرائیوں سے محروم ہونے کے باوجود زندہ‘ پائندہ اور حسین ہیں اور چند موضوعات میں محدود ہوتے ہوئے بھی تغزل سے ملا مل ہیں۔“ (۳۳)

اقبل اس دور کے وہ عظیم شاعر ہیں جنہوں نے قدیم موضوعات ترک کر کے غزل کو جدت کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ انہوں نے صرف قومی و عصری مسائل کی ترجمانی کی ہے بلکہ نئی علامتیں اور اشارات وضع کر کے غزل کے دامن کو وسیع کر دیا ہے۔ ”اقبل محض شاعرانہ جذبے کی تسکین کے لیے تفریحاً شعر نہیں کہتے بلکہ ان کے پیش نظر ایک مخصوص اندازِ فکر‘ ایک متعین عقیدہ اور ایک مربوط نظامِ حیات ہے۔ اور انہیں شعر کی افادی قدروں کا گہرا شعور ہے۔“ (۳۴)

اقبال کی غزلیں تفکر‘ شعریت اور اعلیٰ قومی و ملی مضامین کی وجہ سے غزل گوئی کی تاریخ میں ایک ایسا تجربہ ہیں جو اس سے پہلے کسی شاعر نے اس جامع اور بھرپور انداز سے نہیں کیا۔ ”بل جبریل کی غزلیں لب و لہجہ‘ رنگ و آہنگ‘ نئی زمینوں‘ نئے قافیوں اور نئے مضامین‘ جدتِ تشبیہ و استعارہ‘ ندرتِ خیال‘ اسلوب کی تازگی اور طرزِ ادا کی طرفگی کے لحاظ سے تکمیل فن کا نادر نمونہ ہیں۔“ (۳۵)

اسلوب اور موضوعات نئے ہونے کے باوجود اقبال کی غزلوں میں وہ تمام فنی خصوصیات موجود ہیں جو اچھی غزلوں کا طرہ امتیاز ہوتی ہیں۔

اصغر گوندوی تصوف کے حوالے سے اردو شاعری میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں موضوعات کے تنوع کی بجائے عشقِ حقیقی کی متنوع کیفیات ملتی ہیں۔ تخیل کی سحر کاری‘ رفعتِ مضامین اور بلند آہنگی اصغر کی غزلوں کے نمایاں اوصاف ہیں۔ انہوں نے روحانی و وجدانی خیالات کی مرتع کشی کے لیے جو دل آویز اسلوب اختیار کیا ہے‘ وہ پوری اردو شاعری میں اور کہیں نظر نہیں آتا۔

حالی نے غزل کو نئی راہوں سے آشنا کیا۔ انہیں قوم کی زبوں حالی کا شدت سے احساس تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ قوم خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر ترقی کی شاہراہوں پر گامزن ہو۔ انہوں نے غزل میں وہ موضوعات پیش کیے جو ملی تقاضوں سے ہم آہنگ تھے۔ اس طرح غزل مضامین کے اعتبار سے وسعتوں سے ہم کنار ہوئی۔ ”انہوں نے غزلوں میں سادہ الفاظ میں تکبرانہ نکات‘ آفاق و انفس پر سنجیدہ تبصرے‘ عشق کے پاکیزہ جذبات و تاثرات اور ملی فلاح جیسے اہم مضامین داخل کیے۔“ (۳۱)

حالی نے غزل کو نئے دور کے قومی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی روایت قائم کی۔ اکبر پکبست اور اقبال نے اس روایت کو ترقی دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اکبر الہ آبادی کی غزلوں میں تصوف کے مسائل‘ تہذیبی و سماجی حالات اور حسن و عشق کے معاملات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اگرچہ وہ غزل کے بہت بڑے شاعر نہیں سمجھے جاتے لیکن انہوں نے طنزیہ و مزاحیہ انداز میں زندگی کے بنیادی معاملات پیش کر کے غزل کے دائرے کو وسیع کر دیا ہے۔ ان کے موضوعات و اسلوب سے جدت و شخصیت نمایاں ہے جو ان کی انفرادیت کا ایک بڑا ثبوت ہے۔

تغزل اور سوز و گداز غزل کی روح ہیں۔ اکبر کی غزلوں میں یہ عناصر بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ ”تغزل کا چسکا اکبر کو آخر تک باقی رہا لیکن ابتدائی زمانے کے عاشقانہ جذبات بعد میں متصوفانہ خیالات میں تبدیل ہو گئے تھے... اکبر کی غزل رفتہ رفتہ اخلاق‘ معرفت‘ فلسفہ اور سیاست کے مسائل کی حامل ہوتی گئی ظرافت اور خوش مذاقی جو اکبر کی شاعری کا نمایاں وصف ہے غزل میں بھی موجود ہے۔“ (۳۲)

حسرت موہانی نے غزل کی روایت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ ان کی غزل کے موضوعات مجازی عشق اور اس کی مختلف کیفیات پر مبنی ہیں۔ ان کی غزلوں میں شگفتگی‘ بے باکی اور دلکشی زیادہ ہے اور سوز و گداز کا عنصر بہت کم ہے۔ وہ احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے صداقت و واقفیت کو ملحوظ رکھتے ہیں اور انسانی نفسیات کی اصلی اور صحیح تصویریں پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے غزل میں زندگی کے الم انگیز حقائق پیش کرنے کی بجائے اس کے نشاطیہ پہلوؤں کو زیادہ اجاگر کیا ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے اپنے

ڈاکٹر ابواللیث مدنی ان کی غزلوں کی خصوصیات کے بارے میں لکھتے ہیں:

” اصغر کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کے کلام کی

پاکیزگی اور لطافت ہے۔ اس میں تصوف کے مضامین بھی ہیں لیکن

اصغر نے ان کو ندرت اور تازگی کا پیرہن بخشا ہے۔ تصوف کے ان

مضامین میں تصوف کی عام افسردگی، پشیمانی، اضمحلال اور یاس و

حسرت کی جگہ رقص، کیف اور وجد کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس

کلام کو پڑھ کر انشراحِ قلب و روح ہوتا ہے اور دنیا سے گریز و فرار

کی جگہ یہاں شرافت اور پاکبازی سے زندگی گزارنے کو جی چاہتا ہے۔

اصغر کی غزلوں میں الفاظ کا دروبست ایسا ہے کہ اس سے ایک پرفیض

نغمے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس میں طوفانی لب و لہجہ کی جگہ نرم و

سبک رو چشموں کا ترنم ملتا ہے۔“ (۳۶)

جگر مراد آبادی کی غزل معاملہ بندی، سراپا نگاری، تکرارِ الفاظ، شوخی اور نفسیاتی کیفیات کی عکاسی کے

حوالے سے خاصی معروف ہے۔ سلوگی، روانی اور فارسی تراکیب کا برموقع استعمال جگر کی فنِ شعر میں

مشاقی و مہارت کی دلیل ہے۔ ان کی زبان صاف، شستہ اور بامحاورہ ہے۔ تغزل کا وصف ان کی غزل کا

زیور ہے۔ عشق و محبت کے علاوہ زندگی کے دیگر حقائق و معارف نے بھی ان کے کلام میں تاثیر اور

معنویت پیدا کی ہے۔

فلانی بدایونی کے کلام میں بھی میر تقی میر کی طرح رنج و غم، یاس و محرومی اور مصائب و مشکلات کی

عکاسی کی گئی ہے۔ اسی لیے انہیں یاسیت کا لام کہا جاتا ہے۔ فلانی کی غم پسندی کے پس منظر میں غمِ عشق

بھی ہے اور غمِ دوراں بھی۔ صعوباتِ زمانہ نے جب انہیں دنیا سے دل برداشتہ کر دیا تو ان کی حسیہ شاعری

وجود میں آئی۔ ان کا غم چونکہ مصنوعی نہیں بلکہ دل کی حقیقی کیفیات کا ترجمان ہے۔ اس لیے فلانی کی ہر

غزل اپنے اندر ایک خاص تاثیر رکھتی ہے۔ احتشام حسین فلانی کی غزل کے بارے میں رقم طراز ہیں:

” خلوص اور ذاتی اثر پذیری نے ان کے طرزِ اظہار میں واقفیت

پیدا کر دی ہے اور لب و لہجہ میں ایک نئی کھنک سنائی دیتی ہے جو

خلوص کے بغیر ممکن نہیں۔ جبر اور اختیار کے رسمی عقیدے میں

ذاتی اعتقاد کی وجہ سے تنوعیت میں نجی زندگی کی الم انگیزی کے سبب

نیا پن ہے جو طرزِ اظہار میں نمایاں ہوتا ہے اور فلانی کو دوسرے

غزل گوئیوں سے الگ کرتا ہے۔“ (۳۷)

یاس یگانہ چنگیزی کی غزلیں رنعتِ تمیل، حقیقت نگاری، ندرتِ فکر، جدتِ تشبیہات، عمدہ بندش

الفاظ، طنز اور بے باکی کے لحاظ سے اردو شاعری کا پیش بہا سرمایہ ہیں۔ ”اگر یگانہ کو عشق کا ذاتی تجربہ ہوتا

تو شاید ان کے لہجے میں مٹھاس اور گھلاؤ شہتی۔ ان کے کلام میں بیان کی شدت ہے، لہجے کی صفائی اور

کٹ ہے۔ محاوروں کا استعمال اور زبان و بیان پر عبور۔ یہ باتیں ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہیں۔

وہ پیش پا افتادہ موضوعات میں بھی زبان و بیان کی خوبیوں سے جدت پیدا کر لیتے ہیں۔“ (۳۸)

فیض ترقی پسند شعراء میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے اندازِ بیاں کا ٹیکھا پن دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ انسان دوستی ان کی غزل کا خاص موضوع ہے۔ شدتِ احساس نے ان کے کلام کو اثر انگیز کر دیا ہے۔ ان کی غزلیں غمِ جاہل اور نظمیں غمِ دوراں کی ترجمان ہیں۔ جذبات کا فنکارانہ اظہار ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اگرچہ فیض اشتراکی تصورات کے علم بردار ہیں لیکن ”ان کی اہمیت اس میں ہے کہ انہوں نے جمالیاتی احساس کو انقلابی فکر پر قربان نہیں کیا۔ فیض نے اپنے تخلیقی احساس سے ایسی شعری وحدت کی تخلیق کی جس کی حسن کاری، لطافت اور دل آویزی تو احساسِ جمال کی دین ہے لیکن جس کی درد مندی اور دل آسائی سماجی احساس سے آئی ہے“۔ (۳۹)

فیض کا سماجی شعور چونکہ پختہ بنیادوں پر استوار تھا اس لیے انہوں نے بے مہرگی حالات کے ایٹھ غزلوں میں نقشے کھینچے اور انسان کے دکھ درد کو موضوعِ سخن بنایا۔ یہ کام صرف وہی دلِ درد مند کر سکتا ہے جو دولتِ احساس سے مالا مال ہو۔ بقول ڈاکٹر حامد کاشمیری:

”فیض کی درد مندی بلاشبہ ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہے جو بعض اشعار میں ایک موجِ زیریں کی طرح اور بعض تخلیقات میں فعال روح کی طرح موجود ہے... فیض نے خارجیت پسندی کے باوجود گاہے گاہے دروں بینی سے کام لیا ہے اور اپنے اندرونی وجود سے رابطہ قائم کیا ہے“۔ (۴۰)

غم پسندی کی وجہ سے ناصر کاظمی کو میر ثانی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے ترقی پسندوں کے انداز سے ہٹ کر اظہار کے نئے اسلوب تلاش کیے ہیں۔ ناصر نے جذباتِ الم کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ میر کی طرح انہوں نے چھوٹی بحر میں دنی جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے۔ سادہ الفاظ میں حزن

کیفیات کی عکاسی ناصر کاظمی کے فن کا ایک اہم وصف ہے۔
ڈاکٹر وزیر آغا ناصر کاظمی کے فکر و فن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ناصر کاظمی کی شاعری کے مطالعے سے اس بات کا وافر ثبوت ملتا ہے کہ اس نے تخلیقی کرب میں مبتلا ہو کر ذات کے معنی آفریں اور تہہ در تہہ جہان کا رخ کیا اور پھر اپنی سیاحت کے اثمار کو ہمارے سامنے چننا چلا گیا۔ اس کے کلام کی تاثیر کا اصل سبب بھی یہی ہے کہ یہ کلام ذات کی تہوں سے ابھرا ہے، ذہن کے بلا خانے سے نازل نہیں ہوا“۔ (۴۱)

احمد ندیم قاسمی کی غزل میں نئے عہد کے رجحانات کی آب و تاب نظر آتی ہے۔ انہوں نے اصناف و بحور کا انتخاب بھی بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ انہوں نے بے جا تقلید سے اپنا دامن بچایا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کی انفرادیت کو کلام میں نمایاں ہونے کا موقع ملا ہے۔ ندرت، تازگی، ٹیکھا پن اور بھرپوری ان کے کلام کی اہم خصوصیات ہیں۔ ”احمد ندیم قاسمی نے اپنے دور کے خیب و فراز کا جائزہ لیا ہے۔ اس لیے ان کے یہاں یاس اور امید کی دھوپ چھاؤں ملتی ہے۔ یہ دھوپ چھاؤں عہد حاضر کی نمایاں خصوصیت ہے... قاسمی کی غزلوں میں روانیت کی بجائے خارجیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ ان کا مشاہدہ فطرت زیادہ تیز ہے اس لیے وہ خارجی مناظر کی صحیح عکاسی کر سکتے ہیں“۔ (۴۲)

ان شعراء کے علاوہ اور بہت سے غزل گوؤں نے اردو غزل کے ارتقا میں قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان میں جوہر، صفی، عزیز، ماہر القادری، احسان دانش اور فراق گورکھپوری خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

- ۱- چاند شیخ "سودا" کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۳ء، ص ۳۷
- ۲- اعجاز حسین ڈاکٹر "مختصر تاریخ ادب اردو" کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، مشن روڈ، ۱۹۵۶ء، ص ۸۱
- ۳- صفی مرتضیٰ سید "چند ممتاز شعراء لکھنؤ: نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ، سن ندارد، ص ۱۰
- ۴- ثاقب صدیقی، انیس احمد "خواجہ میر درد (تنقیدی و تحقیقی مطالعہ)" دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۸۹ء، ص ۱۹، ۲۰
- ۵- اعجاز حسین سید "نئے ادبی رجحانات" حیدرآباد: کن بھارت: نفیس اکیڈمی، ۱۹۳۶ء، پارہ سوم ص ۳۲
- ۶- احتشام حسین "انتخاب احتشام حسین" (فقیر احمد فیصل، مرتب) لاہور: لاہور اکیڈمی، سن ندارد، ص ۷۳
- ۷- ن، بخاری "اشارات" کراچی: پاک یونین سنور، ۱۹۶۷ء، ص ۷۹
- ۸- شبیبہ الحسن نونیوی "تنقید و تحلیل" لکھنؤ: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۵۸ء، ص ۵۵
- ۹- رشید احمد صدیقی، پروفیسر "نقش ہائے رنگ رنگ" لکھنؤ: کاروان ادب، ۱۹۷۵ء، ص ۱۰۳
- ۱۰- پیام شاہجہاں پوری "روح نگارش" لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۵۵ء، ص ۱۳۵
- ۱۱- عیادت بریلوی، ڈاکٹر "غزل اور مطالعہ غزل" کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۵ء، ص ۲۳۰
- ۱۲- جمیل جلیلی، ڈاکٹر "تنقید اور تجزیہ" لاہور: یونیورسٹی بکس اردو بازار، ۱۹۸۸ء، ص ۱۷۶
- ۱۳- سلیم اختر، ڈاکٹر "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز اردو بازار، ۱۹۸۷ء، ص ۱۸۸
- ۱۴- اختر اوریدی "قدر و نظر" لکھنؤ: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۵۵ء، ص ۹۳
- ۱۵- عیادت بریلوی، ڈاکٹر "اردو تنقید کا ارتقاء" کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۱ء، ص ۱۷۱
- ۱۶- آسی فیانی "تاریخ ذہن و ادب اردو" لاہور: ڈوگر سنز اردو بازار، ۱۹۹۲ء، ص ۶۸
- ۱۷- عبدالغفور سردری "جدید اردو شاعری" لاہور: شیخ غلام علی ایڈٹرز، ۱۹۶۷ء، ص ۲۸، ۲۹

حوالہ جات

- ۱- آرزو چوہدری "ادب کی چھان بین" لاہور: ادارہ وسن ندارد، ص ۷
- ۲- عیادت بریلوی، ڈاکٹر "تنقیدی زاویے" کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۱ء، ص ۱۰۳
- ۳- "اردو انسائیکلو پیڈیا" لاہور: فیروز سنز، ۱۹۶۳ء، ص ۱۰۲
- ۴- ظ، انصاری "زہن و بیان" دہلی: ۱۹۵۹ء، ص ۳۷
- ۵- حمید احمد خاں، پروفیسر "تنقیدی مقالات" (میرزا اویب، مرتب) لاہور: لاہور اکیڈمی، ۱۹۶۳ء، ص ۱۰۵
- ۶- ایضاً، ص ۱۰۵، ۱۰۶
- ۷- حق، شان الحق، "کتبہ راز" کراچی: عصری کتب، ۱۹۷۲ء، ص ۲۱۹
- ۸- عبداللہ، ڈاکٹر سید "اشارات تنقید" لاہور: مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۲۲ء، ص ۱۳۶
- ۹- فراق گورکھپوری "اردو غزل گوئی" لاہور: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۵۵ء، ص ۵۰
- ۱۰- سلام سندیلوی، ڈاکٹر "ادب کا تنقیدی مطالعہ" لاہور: میری لائبریری، ۱۹۶۳ء، ص ۵۷
- ۱۱- وزیر آغا "تنقید اور اصحاب" لاہور: جدید ناشرین، ۱۹۶۸ء، ص ۳۶
- ۱۲- آزاد، محمد حسین "آب حیات" لاہور: مکتبہ ادب اردو بازار، ۱۹۶۷ء، ص ۸۸
- ۱۳- ممتاز حسین "تنقید کا تاریخی نظریہ" مشمولہ "اردو تنقید نگاری" (سردار سجاد گل، مرتب) لاہور: ماڈرن پبلی کیشنز۔ عقب اردو بازار، ۱۹۶۳ء، ص ۱۵۰
- ۱۴- شیفتہ، نواب مسطیٰ خاں "گلشن بے خار" لکھنؤ: مطبع نول کشور، ۱۹۷۳ء، ص ۲۱۰
- ۱۵- عبداللہ، ڈاکٹر سید "نقد میر" لاہور: مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۶۸ء، ص ۲۳

اردو نظم کا تاریخی و فنی پس منظر

نظم کا لفظ مختلف حوالوں سے مختلف مفہام واضح کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ”لفظ نظم کا عام مفہوم نثر کے برعکس وہ کلام ہے جو اوزان شعری کا تابع ہو“ (۱)۔ عام طور پر نظم کے لفظ کو نثر سے تمیز کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی نظم کہہ کر اس سے شاعری مراد لی جاتی ہے اور اس شاعری میں تمام اصنافِ شعر (مثنوی، مرقعہ، قصیدہ، رباعی وغیرہ) موجود ہوتی ہیں۔ ”شاعری خواہ مخصوص قسم کا تعمیری حسن رکھتی ہو یا تنظیم سے معری ہو، نظم ہی کہلائے گی“۔ (۲)

غلام احمد لکھتے ہیں:

”نظم کی صنفی شناخت بامقصد نہ تو موضوع پر منحصر ہے اور نہ ہیئت پر۔ اردو شاعری کی مختلف اصناف دراصل نظم ہی کی مختلف قسمیں ہیں۔ اسی طرح اردو شاعری میں مروج تمام بیسیں بشمول غزل اور مثنوی کی بیسیوں کے، نظم کے لیے استعمال کی گئی ہیں“۔ (۳)

نظم میں کسی ایک خیال یا کیفیت کو پیش کیا جاتا ہے اور تسلسلِ خیال کو بہر صورت قائم رکھا جاتا ہے۔ اردو نظم کا عہد بہ عہد ارتقاء اور اس کا تاریخی و فنی پس منظر ایک لمبی داستان ہے۔ جس کا یہاں

- ۳۲۔ معراج میر تقی میر ”حسرت موہانی۔ تنقیدی مطالعہ“ لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۷۳ء، ص ۹۹
- ۳۳۔ صادق حسین ”آغا“ ”بروش ہوا“ لاہور: اشاعت ادب، ۱۹۶۱ء، ص ۱۱
- ۳۵۔ صدیق جاوید ”بلی جبریل کا تنقیدی مطالعہ“ لاہور: یونیورسٹی بکس، ۳۰۔ اے اردو بازار، ۱۹۸۷ء
- ۳۶۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، ”آج کا اردو ادب“ لاہور: فیروز سنٹر پبلشرز، ۱۹۷۰ء، ۱۵۷، ۱۵۸
- ۳۷۔ احتشام حسین ”تنقیدی جائزے“ لکھنؤ: احباب پبلشرز، ۱۹۵۶ء، ص ۲۲۸
- ۳۸۔ سیال باقر رضوی ”تہذیب و تخلیق“ لاہور: مکتبہ ادب جدید، ۱۹۶۶ء، ص ۱۸۹
- ۳۹۔ گوپی چند نارنگ ”ادبی تنقید اور اسلوبیات“ دہلی: انجیو کیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۹ء، ص ۲۱۵
- ۴۰۔ حامد کاشمیری، ڈاکٹر، ”تہذیب و تنقید“ نئی دہلی: نئی آواز جامعہ مگر، ۱۹۸۸ء، ص ۳۰
- ۴۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ”تنقید اور مجلسی تنقید“ سرگودھا: مکتبہ اردو زبان، ۱۹۷۶ء، ص ۱۸۰
- ۴۲۔ سلام شہدلو، ڈاکٹر، ”ادبی اشارے“ لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۵ء، ص ۳۳۰، ۳۳۱

مجل انداز میں ذکر کیا جاتا ہے۔ اردو کا پہلا نظم گو شاعر محمد قلی قطب شاہ ہے۔ اس نے سادہ اسلوب میں ہندوستانی رسم و رواج اور تہواروں پر نظمیں لکھ کر شہرت پائی۔

اردو شاعری کی تاریخ میں اگرچہ میر تقی میر اور سودا کو نظم گو شعراء کی حیثیت نہیں دی گئی لیکن ان شعراء نے محسوس، بچوں، شہر آشوبوں اور مشنوں کے ذریعے مسائل حیات کو دلچسپ اسلوب میں پیش کیا اور اپنے عہد کے سیاسی، اخلاقی اور سماجی انحطاط کی کامیاب عکاسی کی۔ ان کے موضوعات کے تنوع نے نظم کے نئے امکانات کی نشان دہی کی اور آگے چل کر شعراء نے اپنے انفرادی، اجتماعی، داخلی و خارجی اور نظریاتی و فلسفیانہ افکار کو نظم کے سانچے میں ڈھالا۔

نظیر اکبر آبادی نے اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے نظموں کے ذریعے اپنی ذات اور اپنے عہد کے رجحانات کی تصویر کشی کی۔ انہوں نے بچپن، جوانی، بڑھاپا، تغیراتِ جہاں، امارت، غربت، موت و حیات، مذہب اور عشق وغیرہ ہر موضوع پر خاصہ فرسائی کی۔ ان کی قوتِ مستحیلہ کی بلند پروازی اور قادر الکلامی نے مظاہر حیات کی ترجمانی کر کے نظم نگاری کو نئی روایات سے شناسا کیا۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

”اردو نظم میں نظیری سب سے بڑی عطا یہ ہے کہ اس نے شعر کو آسمان سے اترنے اور زمین کی بوسوں کی طرف متوجہ کیا اور یوں اپنے وطن کی دھرتی اور اس کی اشیاء ہی کو نہیں بلکہ اس کی روایات، تہذیب اور ثقافتی ماحول سے بھی گہری وابستگی کا ثبوت ہم پہنچایا۔“ (۴)

نظیر نے عوامی زندگی کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا اور وہ زبان استعمال کی جسے عوام سمجھ سکیں۔ ”ان کا بڑا کمال یہی ہے کہ وہ عوام الناس کے خیالات جذبات اور ان کی بول چال کو خود انہیں کی زبان سے ظاہر کرتے ہیں۔“ (۵)

عام خیال یہ ہے کہ نظم گوئی کا باقاعدہ آغاز دورِ جدید میں ہوا ہے۔ ۱۸۶۷ء میں مولانا محمد حسین آزاد نے لاہور میں انجمن پنجاب کی بنیاد ڈال کر نظم نگاری کی تحریک کا آغاز کیا۔

مئی ۱۸۷۳ء میں انجمن پنجاب کی طرف سے ایسے مشاعروں کا اہتمام کیا گیا جس طرحی مصرعوں کی بجائے نظموں کے موضوعات دیے گئے۔ ایسے مشاعروں کو مناظروں کا نام دیا گیا۔ ان مناظروں میں بہت سی ادبی و علمی شخصیات شریک ہوا کرتی تھیں۔ ان شخصیات میں آزاد اور حلی کے علاوہ ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا ذکاء اللہ خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ حلی نے اپنی مشہور مثنویاں برکھارت، نشاطِ امید، حب وطن اور مناظرِ رحم و انصاف انہی مناظروں میں پیش کیں۔ اسی دور میں اسماعیل میرٹھی، اکبر اللہ آبادی، مولانا شبلی، سرور جہاں آبادی، نادر کاکوروی، اقبال، پکبست، صفی لکھنوی، شوق قدوائی اور ظفر علی خاں وغیرہ نے اپنی مساعی کے ذریعے اس صنفِ شعر میں ایک نئی روح پھونک دی۔

اگرچہ محمد حسین آزاد نے جدید انداز کے مانعے منعقد کر کے نظم گوئی کی بنیاد ڈالی لیکن الطاف حسین حلی نے ذوق و شوق سے نظمیں لکھ کر شاعری میں نئے رجحانات داخل کیے۔ حلی کی نظمیں منظر نگاری، سیرت نگاری، فلسفہ اخلاق، واقعہ نگاری، فلسفہ قومیت، صداقت شاعری، انسان دوستی، سادگی اور سبے ساختگی کے لحاظ سے اچھی شاعری کا ایک نادر نمونہ ہیں۔ جیلانی کامران ان کی مسدس ”مدو جزیر اسلام“ کے بارے میں لکھتے ہیں:

”حلی کی مسدس جس تہذیبی دورِ آزمائش کا اعلان کرتی ہے، مسلمانوں کی تہذیب ابھی تک اسی دورِ آزمائش سے گزر رہی ہے۔ مسدس حلی اس لحاظ سے مسلمانوں کے دورِ جدید کی سب سے بڑی نظم ہے۔ کیونکہ یہ نظم ایک طرف اسلام کو تہذیبی تصور کے طور پر پیش کرتی ہے اور دوسری طرف اسلام کو ایک تہذیب کے نام سے موسوم بھی کرتی ہے۔“ (۶)

حلی کی طرح شبلی نعلانی بھی اگرچہ دل میں قومی دور رکھتے ہیں لیکن انکی منظومات کا ایک خاص انداز ہے۔ وہ بصیرت یافتہ تاریخ دان بھی ہیں اور سیاسی حالات کے جائزہ نگار بھی۔ انہوں نے تاریخ و سیاست

کاہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور مصلحت پسندی کی بجائے جوش و خروش اور جرأت اور بے باکی سے تلخ حقائق کو نظموں کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ ”شبلی نے اسلامی تاریخ کے بہت سے اہم واقعات کو نظم میں بیان کیا ہے اور ان نظموں کے ذریعے اسلامی احکام و تعلیمات کو دلنشین انداز میں پیش کیا ہے۔“ (۷)

شبلی کی تاریخی و اخلاقی نظمیں ان کے اسلامی مزاج اور گہرے سماجی شعور کی پیداوار ہیں۔ ”ان کے اسلوب میں ایک شکستگی، بائکن اور چستی ملتی ہے۔ شبلی کے یہاں عالمانہ شان ہے مگر خشکی نہیں۔ شبلی زاہدِ خشک نہیں تھے، وہ شاعر تھے۔“ (۸)

پکبست کی نظموں کے مخصوص موضوعات نے انہیں نظم نگاری کے میدان میں انفرادی خصوصیت عطا کر دی ہے۔ ان کے یہاں معاملاتِ حسن و عشق برائے نام نظر آتے ہیں۔ وہ شریقی تہذیب و تمدن کے دلدادہ ہیں۔ ان کی نظموں میں اہل وطن کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کا پیغام ملتا ہے۔ سیاسی حالات کو منظوم پیرائے اظہار عطا کرنا ان کا امتیازی جوہر ہے۔ ان کا ناصحانہ کلام بھی شاعر سے خیالاً نہیں۔ ان کی ذاتی زندگی بھی شرافت، و نعداری اور سادگی کا عمدہ نمونہ ہے۔ اثر لکھنؤی ان کے فکر و فن کے بارے میں لکھتے ہیں:

”پکبست کا کلام ان کے کردار کا آئینہ ہے۔ انتہائی غیرت اور خودداری کے باوجود کبر و نخوت کا شائبہ نہیں۔ سوز و گداز و خشکی کے باوصف ہاں و حواں کی افسردگی ہے نہ محرومی کی فریاد و زاری۔ جوش و خروش کی فراوانی ہے مگر کلام مبالغے سے پاک اور حقیقت سے ہمکنار ہے۔“ (۹)

نظم گو شعراء میں اقبال کا مقام بہت بلند ہے۔ وہ زبان و بیان کی نزاکتوں سے بھی واقف تھے اور زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے رازوں بھی تھے۔ ”اقبال نے اردو شاعری کو خودی کے تصور سے آشنا کیا۔ انقلاب کے خیال کو عام کیا اور غور و فکر کی گہرائیاں عطا کیں۔“ (۱۰)

ان کے ابتدائی دور کی نظموں میں قومیت و وطنیت کے نظریے کی حمایت موجود ہے۔ لیکن جب وہ انگلستان سے تعلیم حاصل کر کے واپس آئے تو ان کے ذہن سے جغرافیائی اور سیاسی نظریے کا غبار چھٹ چکا تھا۔ چنانچہ وہ اٹھارہویں صدی کے داعی بن گئے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں مسلمانوں کو اتحاد، اتفاق اور یکجہتی کا پیغام دیا اور مغربی تہذیب کے زہریلے اثرات سے آگاہ کیا۔ انہوں نے اپنے کلام کے ذریعے مسلمانوں کو اسلامی فلسفہ حیات سے روشناس کرنے کی کوشش کی اور ملت پرستی سے روحانیت کی طرف متوجہ کیا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، کلامِ اقبال کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اقبال نے اردو شاعری کے رخ کو موڑ دیا اور زندگی کے حقائق کا ایک وسیلہ بنایا۔ ان کی شاعری نے اردو شاعری کا مزاج بدل دیا۔ اس میں درمانگی، بے چارگی اور محرومی کا جو یاس انگیز اور حسرت خیز انداز تھا اس کی جگہ ایک توانائی، امنگ اور ولولہ پیدا کیا۔ قنوطیت کی جگہ رجائیت، مایوسی کی جگہ امید، خوف کی جگہ جرأت کا مسلک عام کیا۔“ (۱۱)

اقبال کے بعد ہرش نے خاصی شہرت پائی۔ ان کی ابتدائی نظموں میں زیادہ تر مناظرِ فطرت کی تصویر کشی پائی جاتی ہے۔ ان کی سیاسی و روحانی نظموں میں لہجے کی گھن گرج اور یجلی کیفیت کا اظہار ملتا ہے۔ پر شکوہ الفاظ اور تادر تشبیہات و استعارات ان کے کلام کی پہچان ہیں۔

پاکستان کے قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری کے گیت، مترنم، محروں، رواں دواں الفاظ اور موسیقیت کی وجہ سے اردو کی غنائی شاعری میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا اصل اور یادگار کارنامہ ”شاہنامہ اسلام“ ہے جس میں انہوں نے اسلامی تاریخ کو نظم کیا ہے۔

اختر شیرانی کا روحانی شعراء میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کی روحانی شاعری میں غم کی شدت نہیں بلکہ رحمتی، ملامت اور رجائیت پائی جاتی ہے۔ وہ حسن پرستی اور ہوس پرستی میں فرق ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان کی

نظموں میں حسنِ اکبری جمل آفرینی اور بلورائی بے خودی پائی جاتی ہے۔ اختر نے عربی و اہنڈال سے دامن بچانے کی کوشش کی ہے۔ حسن و عشق اختر شیرانی کے کلام کے بنیادی اجزاء ہیں۔ وہ عورت کو قدرت کا انمول تحفہ اور حسین ترین تخلیق سمجھتے ہیں۔ اسی لیے ان کی نظموں کا محور و مرکز عورت ہے۔

بقول ڈاکٹر محمد حسن:

”عورت اس کا حسن اس کی محبت اختر کے نزدیک خلاصہ کائنات ہے۔

اختر نے روزِ ترو کی زندگی اور اس کی یکسانیت کو ٹھکرا دیا ہے اور اپنے

لے زمین و آسمان سے الگ ایک نئی دنیا کی تعمیر کی ہے۔ بہاروں اور

فطرت کے نظاروں کی دنیا، پاکیزگی خلوص اور جذباتی (غور کی دنیا) ہر

رومانوی کی طرح اختر کے کلام کی بھی بنیادی قدر یہی ہے۔“ (۱۲)

اختر شیرانی نے تصورِ عشق کو بدلا۔ انہوں نے عذرا د سلسلی کے روپ میں ایسی محبتوں کا تصور

پیش کیا ہے جو اسی دنیا اور اسی ماحول کی رہنے والی ہیں۔ بقول آل احمد سرور:

”ان کا عشق قدیم شعراء کی طرح نہ کسی تجلی موہوم کا عشق ہے نہ

متوسلین کی شہد بازاری کا نہ ایک سرد و بے رنگ عورت کا۔ بلکہ ایک

ایسی عورت کا عشق ہے جو اس دنیا کی ہے، پہلو میں دل رکھتی ہے اور

دل میں لطیف جذبات۔ جو شاعر کے عشق سے متاثر بھی ہوتی ہے اور

کبھی کبھی اپنے جذبات کا اظہار بھی کرتی ہے لیکن بعض اوقات سماجی

بندشیں اسے اجازت نہیں دیتیں کہ محبت کا جواب محبت سے دے۔“ (۱۳)

احسان دانش کو شاعرِ مزدور کہا جاتا ہے۔ انہوں نے چونکہ خود ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی

تھی اس لیے انہوں نے اپنی نظموں میں غریب اور مزدور طبقے کے مسائل اور تلیوں کو نہایت مؤثر

دانشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی رومانی نظمیں بھی بڑے والہانہ و پرتاثر اسلوب میں لکھی گئی ہیں۔
فرزانہ سید لکھتی ہیں:

”احسان دانش کے یہاں شیریں الفاظ بھی موجود ہیں اور دلکش و پرکشش

ترکیب بھی۔ دیہات کا رنگ بھی ہے اور مانوس ماحول بھی۔ وہ ٹھہراؤ

سے بھی متصف ہیں اور علمی وقار کو بھی برقرار رکھتے ہیں۔ وہ فنی

لطفوں کے ساتھ ساتھ روایت کے بھی علم بردار ہیں۔ ان کے یہاں

موضوعات میں تنوع اور خیالات میں گہرائی بھی ہے۔ وہ شگفتہ، پاکیزہ اور

متین زبان و بیان کے دہنی ہیں۔“ (۱۴)

احسان دانش نے تخیل سے زیادہ سماجی حقائق اور تجرباتی شواہد کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ وہ تیز

مشاہدے کی بدولت مظاہرِ حیات کے باریک سے باریک پہلو کو بھی احاطہ گرفت میں لے آتے ہیں۔ بقول

عبد القادر سروری:

”عام طور پر احسان کا اندازِ بیاں، ان کی تشبیہیں اور استعارے عام فہم

ہوتے ہیں۔ بیانیہ شاعری اور مرقع نگاری کرتے ہوئے وہ ایسی جزئیات کو

بھی نظر انداز نہیں کرتے، جن پر دوسروں کی نظر نہیں پڑتی۔“ (۱۵)

اسرار الحق مجاز اپنی نظموں میں فرسودہ روایتی نظام کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں

سماجی ماحول کو بدلنے کی آرزو ملتی ہے۔ متوسط طبقے کے اہترحالات، نوجوانوں کی بے روزگاری اور مفلسی

ان کی منظومات کے خاص موضوعات ہیں۔ فکر، اعتراف، خواب، سحر اور عشرتِ تنہائی ان کی مشہور نظمیں

ہیں۔ احتشام حسین ان کے فکر و فن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مجاز کی شاعرانہ اور فنکارانہ صلاحیت نے انہیں نغمہ اور ترنم،

کرب اور نشاط، خیال پرستی اور سماجی شعور کا ایک حسین مرکب بنا

دیا ہے... حقیقی سیاسی شعور کی ابتدا مجاز سے ہوتی ہے۔ مجاز کے کلام میں روانیت کے باعث فن کارانہ وابستگی، گرم جوشی، تفکر اور شعریت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔" (۱۶)

ساحر لدھیانوی کی نظموں میں معاشی ناہمواریوں کے خلاف احتجاج ملتا ہے لیکن یہ احتجاج دیگر ترقی پسندوں کی تحریروں کی طرح سیاسی پروپیگنڈے کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ شورش کاشمیری اور نعیم صدیقی نے زیادہ تر سیاسی، سماجی اور اسلامی موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ نکلیل بدایونی نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ رومانی نظموں کے علاوہ ان کی نعتیں بھی عقیدت و محبت کا مظہر اور قدرتِ کلام کی ترجمان ہیں۔

حمیدہ و نعتیہ منظومات بھی ہر دور میں لکھی جاتی رہی ہیں۔ حالی، محسن کاکوروی، اقبال، بیدم داراشی، بہزاد لکھنوی، ظفر علی خاں، حفیظ جالندھری، ماہر القادری، نعیم صدیقی، حفیظ تائب، مظفر وارثی، عبدالعزیز خالد، راغب مراد آبادی، جعفر بلوچ، آثم فردوسی، ایاز صدیقی، ہلال جعفری اور احسان دانش کا شمار نمایاں نعت نگاروں میں ہوتا ہے۔

اردو نظم نگاری کو صالح روایات سے ہم آہنگ کرنے والے شعراء میں اسد ملتانی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان کے بارے میں اگرچہ کچھ زیادہ نہیں لکھا گیا۔ تاہم وہ ایسے قومی شعراء میں شامل ہیں جنہیں کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ "ان کی نظموں میں اکبر کاکوروی، حالی کے پند و نصائح، قومی درد، اقبال کا تفکر اور حب الوطنی کا ایک نہایت عمدہ امتزاج ملتا ہے۔ موجودہ دور میں وہ واحد شاعر تھے جس نے حالی اور اقبال کی روشِ شاعری کو نہ صرف کامیابی کے ساتھ برتا بلکہ اس لے کو آگے بڑھایا اور اس کی مصلحانہ شان برقرار رکھی۔" (۱۷)

۱۹۳۵ء میں ترقی پسند تحریک غیر ملکی نظریات اور ایک مخصوص سیاسی فلسفے کو لے کر اٹھی تھی لیکن چونکہ اس کا دائرہ کار محدود اور خیالات مستعار تھے اس لیے جلد ہی ناکام ہو گئی۔ اس کی ناکامی کی وجہ کچھ

"ایمان و ایقان کی کمی اور کچھ مخصوص حالات کی عدم موجودگی تھی جس میں اشتراکیت کو پھیلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ تحریک اعتماد کی بجائے ذہنی خلفشار اور سماجی انتشار ہی تک محدود رہ گئی۔" (۱۸)

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر آزاد نظم کو عروج حاصل ہوا۔ آزاد نظم قافیہ و ردیف کی پابندی سے آزاد ہے۔ اس میں اگرچہ اول تا آخر ایک ہی بحر کا التزام کیا جاتا ہے لیکن بحر کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے کہیں چھوٹا اور کہیں بڑا کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اوزان میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔

آزاد نظم کی ابتدا کرنے والے اگرچہ عبدالملک شمس الدین تھے لیکن ان کے دور میں وہ ماحول نہ تھا جس میں یہ صنفِ سخن نشوونما پا سکتی۔ جب حالات سازگار ہوئے تو ڈاکٹر تصدق حسین خلد اور ن۔ م۔ راشد نے اسے رواج دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے ساتھ ساتھ میراجی، جواد زیدی، ضیاء جالندھری، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، مختار صدیقی اور احمد ندیم قاسمی نے اس صنف کو خاصی ترقی دی۔ آزاد، نثری اور معرعی نظم نے جدید دور میں اگرچہ خاصا رواج پایا ہے لیکن پابند نظم کی قدر و منزلت اور مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

موجودہ دور کے ایک بڑے شاعر میں امروہوی نے کئی شعری اصناف میں طبع آزمائی کر کے مشاق اور قادر الکلام شاعر ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے نظم گوئی کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ ان کی حمدیں، نعتیں، منتقبتیں اور ملی و رومانی نظمیں ان کی قادر الکلامی کا ثبوت ہیں۔

حوالہ جات

- ۱- خاخر غزنوی "جدید اردو ادب" لاہور: سنگ میل پبلشرز اردو بازار، ۱۹۸۵ء، ص ۳۱
 - ۲- احشام حسین "اردو نظم کا تاریخی اور فنی ارتقاء" مشمولہ "روح تنقیدی ادب" (محمد یعقوب خاں، مرتب) عشرت پبلشرز ہاؤس، ۱۹۶۳ء، ص ۹۹
 - ۳- عظیم احمد "اصنافِ سخن اور شعری سبکیں" لاہور: مکتبہ عالیہ اردو بازار، ۱۹۸۳ء، ص ۱۱
 - ۴- وزیر آغا، ڈاکٹر "اردو شاعری کا مزاج" لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۳ء، ص ۳۳۰
 - ۵- رام پو سکینہ "تاریخ ادب اردو" لاہور: گلوب پبلشرز چوک جناح انارکلی، سن ندارد، ص ۳۸۷
 - ۶- جیلانی کامران "تنقید کا نیا پس منظر" لاہور: مکتبہ ادب جدید، ۱۹۶۳ء، ص ۹۵
 - ۷- ہارون الرشید، پروفیسر "اردو ادب اور اسلام" (جلد اول حصہ نظم) لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، ۱۹۶۸ء، ص ۷۳
 - ۸- آل احمد سرور "تنقید کیا ہے" کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۲ء، ص ۷۳
 - ۹- اثر لکھنوی "چھان بین" لکھنؤ: سرفراز قومی پریس، ۱۹۵۰ء، ص ۷
 - ۱۰- عہدوت بریلوی، ڈاکٹر "تنقیدی زاویے" کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۱ء، ص ۲۶۱
 - ۱۱- ابواللیث صدیقی "آج کا اردو ادب" لاہور: فیروز سنز، ۱۹۷۰ء، ص ۱۰۶
 - ۱۲- محمد حسن، ڈاکٹر "اردو ادب میں رومانوی تحریک" لاہور: شیخ محمد بشیر اینڈ سنز اردو بازار، ۱۹۵۵ء، ص ۶۵
 - ۱۳- آل احمد سرور "ادب اور نظریہ" لکھنؤ: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۵۳ء، ص ۸۰، ۸۱
 - ۱۴- فرزاد سید "نقوش ادب" لاہور: سنگ میل پبلشرز اردو بازار، ۱۹۸۶ء، ص ۲۲۱
 - ۱۵- عبدالقادر سروری "جدید اردو شاعری" لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۶۷ء، ص ۲۸۸
 - ۱۶- احشام حسین "تنقید اور عملی تنقید" لکھنؤ: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۶۱ء، ص ۲۷۱، ۲۷۲
 - ۱۷- جیل نقوی "تنقید و تنہیم" کراچی: ادب نمائے ۱۹ - بلاک جے شمالی ناظم آباد، ۱۹۸۳ء، ص ۱۳۷
 - ۱۸- ریاض احمد "تنقیدی مسائل" لاہور: اردو بک سنٹر بیرون لوہاری گیٹ، ۱۹۶۱ء، ص ۳۲
- مرثیہ عربی لفظ "رثا" سے بنا ہے۔ اس سے مراد ایسی نظم ہے جس میں کسی مرنے والے کی مدح و توصیف اور اظہارِ رنج و غم کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ حزن کی کیفیات کا اظہار وہی کر سکتا ہے جس کا مرنے والے کے ساتھ خصوصی تعلق ہو۔ "مرثیے کا ضروری عنصر خلوص اور وفاداری ہے۔ کیونکہ بغیر اس کے مرثیے میں تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ مرزا غالب کا مرثیہ عارف پر، حالی کا مرثیہ غالب پر اور اقبال کا مرثیہ داغ پر۔۔۔۔۔ اردو میں مرثیہ گوئی کی بہترین مثالیں ہیں جن میں خلوص اور صداقت بدرجہ اتم موجود ہے" (۱)۔ مرثیے کی دوسری قسم میں دینی رہنماؤں بالخصوص حضرت امام حسینؑ اور ان کے اعزاء و شہدائے کربلا کا ذکر کیا جاتا ہے۔
- مرثیہ اردو شعراء کا اپنا ایجاد کردہ ہے۔ یہ دیگر اصنافِ شعری طرح کسی اور زبان کی روایت کو پیش نظر رکھ کر نہیں لکھا گیا۔ یہ صنفِ شعری خصائص کا مجموعہ ہے۔ اس میں غزل کی طرح جذبات و احساسات کی عکاسی کی جاتی ہے اور مثنوی و قصیدہ کی طرح خارجی مناظر و مظاہرِ فطرت کی مسوری کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

مرثیے کے اجزائے ترکیبی میں چہرہ 'سرپا' رخصت 'آمد' رجز 'جنگ' شہادت 'بین اور ساقی نامہ شامل ہیں۔ مرثیے کے موضوعات ایسے واقعات پر مبنی ہوتے ہیں جن میں سرپا 'رزم' 'بزم' 'خود ستائی' 'تکوار اور گھوڑے کی تعریف پائی جاتی ہے۔

ہیت کے اعتبار سے پہلے مرثیہ 'ثلث' 'مربع' اور 'مخمس' کی شکل میں لکھا جاتا تھا۔ انیس اور دبیر کے دور سے کچھ پہلے شعراء نے دوسری تمام ہیتیں ترک کر دیں اور مرثیہ صرف 'مستدس' کی شکل میں لکھا جانے لگا۔ اور یہ صنفِ سخن واقعاتِ کربلا کے اظہار کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی۔ مرثیے کی ہیت کے بارے میں سید اعجاز حسین کا بیان ہے:

"یہ صرف مرثیے کا اثر تھا کہ مستدس کی شکل اس قدر ہر دل عزیز ہو

گئی۔ انیس و دبیر نے اپنے کلام کو مستدس میں اتنے موثر انداز میں

پیش کیا تھا کہ بیانیہ شاعری کے لیے یہی صورت آنے والی نسلوں کو

بہترین معلوم ہوئی۔ چنانچہ دورِ جدید کے اکثر سربر آوردہ شعراء آزاد

'حلی' 'اقبال' 'پلکست وغیرہ نے اپنے بیانات زمانے تک پہنچانے

کے لیے مستدس ہی کا انتخاب کیا۔" (۳)

ابتداء میں دکنی شعراء نے مرثیے لکھے۔ بعد میں سودا، آبد، میرضاحک، میر تقی میر، مصحفی، نظیر اکبر آبادی اور قائم چاند پوری نے مرثیے کے حدود داخل نکھارنے اور سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ خلیق، ضمیر، و گلبر، فصیح، انیس اور دبیر نے صوری و معنوی لحاظ سے اس صنفِ شعر کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا۔

میر ضمیر کے مرثیوں میں کئی ایسے خصائص ملتے ہیں جنہوں نے اس صنفِ شعر کو ان غیر موزوں الفاظ و تراکیب سے پاک کیا جو قدیم مرثیہ نگاروں کے ہاں بکثرت موجود تھے۔ تشبیہات کی جدت اور تخیل کی ندرت کے حوالے سے انہوں نے مرثیہ نگاری کو نئی جہتوں سے متعارف کرایا۔ جنگلی مناظر کی تصویر کشی میں انہیں خصوصی مہارت حاصل تھی۔

شبیبہ الحسن، میر ضمیر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جس شاعر نے مرثیے کے اجزا مرتب کیے، اخلاقی شاعری کو رواج

دیا اور زبان و بیان کو معراجِ کمال تک پہنچایا وہ میر ضمیر تھے۔ میر ضمیر

نے مرثیے کا کیوس وسیع کیا اور اسے جدید تقاضوں کے مطابق بنانے

کی کوشش کی... یہی سبب ہے کہ بیشتر ناقدین نے میر ضمیر کو انیس و

دبیر کا اصل پیش رو قرار دیا ہے۔" (۳)

میر بر علی انیس کے مرثیے فصاحت و بلاغت، تشبیہات و استعارات، واقعہ نگاری، کردار نگاری،

جذبات نگاری اور منظر کشی کے حوالے سے فنِ مرثیہ نگاری کے جملہ لوازمات پورے کرتے ہیں۔ انہوں

نے اردو مرثیہ نگاری کو ایک باوقار مقام عطا کیا ہے۔ اہل بیت کے جذبات کی مصوری ہو یا واقعاتِ کربلا کا

بیان، انیس کے یہاں اصلیت کا رنگ نمایاں رہتا ہے۔ اسی اصلیت و واقعیت نے ان کے مرثیوں کو وقع

اور معتبر بنا دیا ہے۔ بقول شبلی نعمانی:

"میر انیس نے جس قدر واقعات لکھے ہیں، باوجود رقت انگیز اور

موثر ہونے کے واقعیت کے قالب میں اس قدر ڈھلے ہوئے ہیں

کہ کہیں سے ان پر حرف گیری نہیں ہو سکتی۔" (۳)

انیس انسانی فطرت کے نفس شناس ہیں۔ انسانی نفسیات کی تصویر کشی میں انہیں کمال حاصل ہے۔

بلاغت کا یہ تقاضا ہے کہ تخلیق کار کا بیان اشخاص کی حرکات و سکنات اور سیرت سے مطابقت رکھتا ہو۔

ڈاکٹر احرار نقوی لکھتے ہیں:

"انیس نے سینکڑوں مرثیے لکھے ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں اشعار قلم

بند کیے ہیں۔ انسانی نفسیات و خصائل کے بہت ہی عجیب و غریب

پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ نفسیات و جذبات کو زبان اور تصویر عطا کی

غور و فکر اور اصلاحِ احوال پر ابھارتی ہے اور جذبات نگاری دلوں کو مظلومینِ کرپا کی محبت و عقیدت سے سرشار کرتی ہے۔

نسیم امروہوی کو موجودہ دور کے مرثیہ نگاروں میں بلند مقام حاصل ہے۔ انہیں علم و ادب سے خصوصی شغف ہے۔ انہیں روزمرہ اور محاورات کے استعمال پر خصوصی عبور حاصل ہے۔ ان کے مرثیے فصاحت و بلاغت، نکتہ آفرینی، فلسفیانہ طرزِ استدلال، رعایتِ لفظی اور جدید تشبیہات و استعارات سے مزین ہیں اور ان خصوصیات کے حامل ہیں جو لکھنوی شعراء کا طرہ امتیاز ہیں۔ منظر عباس نقوی لکھتے ہیں:

”نسیم امروہوی کے مرثیوں میں اصلاحی عنصر ہر جگہ غالب ہے۔

حریت، انقلاب، جہدِ حیات، جذبہ عزم و عمل، اتحادِ ملت، اسلام

اور انسانیت ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔“ (۹)

قیصر بارہوی نے اردو مرثیے کی کلاسیکی روایات سے ہٹ کر ایک اسلوبِ خاص اپنایا ہے۔ وہ حضرت امام حسینؑ اور قائدِ کربلا کے تاریخی حقائق کے پس منظر میں موجودہ دور کے روح فرسا حالات کا جائزہ لیتے ہیں اور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کا خواب دیکھتے ہیں جس میں امن، انصاف، رواداری اور احترامِ انسانیت کا دور دورہ ہو اور کوئی کسی کو ظلم و ستم کا نشانہ نہ بنا سکے۔ حسن عسکری کاظمی، قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

”قیصر بارہوی نے عصری مسائل کو سامنے رکھ کر مرثیہ کہنے کی طرح

ڈالی ہے۔ یہ ایسی نئی حقیقت ہے جسے ان کے ہر مرثیے کے

تاروپود میں خونِ گرم کی طرح محسوس کیا جاسکتا ہے۔ وہ آج کے

مسائل کا حوالہ، عصری جہت کی نشان دہی اور اس سے پیدا ہونے

والی قباحتوں کا بطورِ خاص اپنے مرثیوں میں اس طرح تجزیہ کرتے

ہیں کہ وہ قاری یا سامع کو اپنا فکری ہم سفر بنا لیتے ہیں۔“ (۱۰)

ہے۔ اظہار و ابلاغ کی خواہیدہ صلاحیتوں کو حرف و صوت لے مدارج

دیے اور اس طرح فکر و فن میں افق در افق پیدا کر دیے۔“ (۵)

حلی کے قول کے مطابق: ”واقعات کی آتش کشی اور تاثیرِ بیاں کے لحاظ سے میر انیس نے اردو

شاعری کو اعلیٰ درجے پر پہنچا دیا۔“ (۶)

مرزا دبیر، میر ضمیر کے شاگرد تھے۔ جدید تشبیہات، استعارات، شوکتِ الفاظ اور زورِ کلام کی وجہ

سے وہ اردو مرثیہ نگاری کی آبدہ ہیں۔ مضمون آفرینی اور صنائع و بدائع کے استعمال کی وجہ سے ان کا اساتذہ

سخن میں شمار ہوتا ہے۔ ان کا کلام ان کی جدتِ فکر کا آئینہ دار ہے۔ ”چہرہ اور سرپا میں مضمون آفرینی

دبیر کی امتیازی خصوصیت ہے۔ انہوں نے اپنی قوتِ تخیل اور بلند فکری افکار کی مدد سے نئے نئے پہلو نکالے

ہیں۔“ (۷)

میر انیس اور مرزا دبیر کی فصاحت و بلاغت نے فنِ مرثیہ نگاری کو بامِ عروج پر پہنچا دیا ہے۔ زبان و

بیاں پر قدرت، مشاہدات و تجربات کی بوقلمونی اور دلکش اسلوبِ سخن نے ان مرثیہ نگاروں کے کارناموں کو

وہ شہرت بخشی ہے جو بہت کم شعراء کے حصے میں آئی ہے۔ ”شبلی نے موازنہ انیس و دبیر میں انیس و دبیر

کے مرثیوں کی قدر و قیمت کے تعین کے لیے جس پیمانے کو تمام تنقیدی پیمانوں پر اہمیت دی ہے وہ فصاحت

و بلاغت کا ہی پیمانہ ہے۔“ (۸)

اگرچہ بیسویں صدی کے آغاز تک اردو شعراء کا رجحان طبع تبدیل ہو گیا لیکن کچھ شعراء نے مرثیہ

نگاری سے اپنا دامن وابستہ رکھا اور اس صنفِ شعر کے گھٹس کی خونِ دل سے پرورش کرتے رہے۔

ان وابستگانِ شوق میں جوش ملیح آبادی، نجم آندی، جمیل مظہری، آلِ رضا، نسیم امروہوی، سکندر

مہدی آغا، قیصر بارہوی، وحید الحسن ہاشمی، شائق زیدی اور افسر عباس زیدی کے نام خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

جوش کے مرثیوں میں وہی تھن گرج اور دبہ و طنطنہ ہے جو ان کے دیگر کلام کا امتیازی وصف

ہے۔ ان کے مرثیوں میں جذبات نگاری و فکر انگیزی کے عناصر یکجا ہو گئے ہیں۔ فکر انگیزی قاری کو

موجودہ دور کے شعراء کی ایک معقول تعداد مرثیہ نگاری کے فروغ و ارتقاء کے لیے جوش و خروش سے سرگرم عمل ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ میر انیس کے بعد مرثیہ نگاری کا سفر رک گیا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد مرثیہ نگاروں نے نئی شعری تحریکوں اور جدید رجحانات کا بغور مطالعہ کیا ہے اور نئے مرثیے کو صورتی و معنوی محاسن دیے ہیں۔ بقول ڈاکٹر اسد اریب:

”ہمارے خیالات کے نئے آفاق پر مرثیہ اب جدید زندگی کی روشن علامتوں، نئے سیاسی اور سماجی استعاروں اور دھنک کی خوش رنگ لہروں کا ایک ایسا مرتفع بن گیا ہے جو کہیں کہیں تو خود اردو نظم کے لیے بھی قابل رشک ہے۔“ (۱۱)

جدید مرثیہ نگاروں میں ریس امرہوی ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اگرچہ کئی اہم نثری نثر میں خام فرسائی لی ہے لیکن مرثیے کو انہوں نے ذوق و شوق سے اپنایا ہے۔ صنف مرثیہ سے ان کے خصوصی شغف کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی خاندانی عقائد و نظریات کے حوالے سے ان کا اثنا عشری ہونا ہے۔ اس لیے آئمہ اہل بیت سے ان کی عقیدت فطری و موروثی ہے۔ رئیس بچپن سے ہی امرہویہ کی مجالس عزا اور محافل قصیدہ خوانی میں پابندی سے شریک ہوتے رہے۔ ان محافل نے ان کے شوق مرثیہ خوانی و مرثیہ نگاری کو پروان چڑھایا اور ان کے قلم سے یادگار مرثیے وجود میں آئے۔ بقول رئیس:

آج امرہوی میں وہ ماہِ عزا کا اہتمام
وہ عزا خانے، وہ پاکیزہ مجالس صبح و شام
وہ علم اللہ اکبر، ان کا حسن انتظام
اہل امرہویہ کو تھا دس روز تک صرف ایک کام
کریلا کی یاد میں اشکوں سے منہ دھوتے رہے
یا علم کے ساتھ دن بھر گشت یا روتے رہے

حوالہ جات

- ۱۔ سلام سندھوی، ڈاکٹر، ”ادب کا تنقیدی مطالعہ“ لاہور: میری لائبریری، ۱۹۶۳ء، ص ۵۸، ۵۹
- ۲۔ اعجاز حسین، سید، ”نئے ادبی رجحانات“ حیدرآباد دکن بھارت: نئیس اکیڈمی، ۱۹۳۶ء، ص ۳۸
- ۳۔ شبیبہ الحسن (دیباچہ) مشمولہ ”آیات آمنہ“ (از قیصر بارہوی) لاہور: سفینہ پبلی کیشنز، ۲۵۳۔ ایف رحمن پورہ، ۱۹۸۸ء، ص ۱۱
- ۳۔ شبلی نعمانی، ”موازنہ انیس و دبیر“ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء، ص ۹۸
- ۵۔ اجاز نقوی، ڈاکٹر، ”انیس ایک مطالعہ“ لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۸۲ء، ص ۲
- ۶۔ حلی، الطاف حسین، ”مقدمہ شعرو شاعری“ کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، سن ندارد، ص ۱۸۱
- ۷۔ طارق سعید، ”کلاسیکی اردو شاعری کی تنقید“ علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۹ء، ص ۳۸۸
- ۸۔ ابوالکلام قاسمی، ”مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت“ نئی دہلی: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۳ء، ص ۲۱۸
- ۹۔ منظر عباس نقوی، پروفیسر، ”اسلوبیاتی مطالعہ“ علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۹ء، ص ۱۸۶
- ۱۰۔ حسن عسکری، قاسمی، پروفیسر، ”قیصر بارہوی کے منفرد مرثیے“ لاہور: حلقہ شعرائے اہل بیت، ۱۹۹۰ء، ص ۸، ۹
- ۱۱۔ اسد اریب، ڈاکٹر، ”اردو مرثیے کی سرگزشت“ لاہور: کاروان ادب، ۱۹۸۹ء، ص ۳

اردو قطعہ نگاری کا تاریخی پس منظر بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

” اردو میں قطعہ نگاری کے چار ادوار ہیں۔ پہلا دکنی دور جس کی نمائندگی نصرتی، محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، خواجہ غلامی اور ولی وغیرہ کرتے ہیں۔

دوسرا دور شمالی ہند میں حاتم سے شروع ہو کر میر و سودا اور اس کے بعد حسن و مصحفی و انشاء سے ہوتا ہوا لڑوق و غالب پر ختم ہوتا ہے۔ تیسرا دور حلی سے شروع ہوتا ہے اور اقبال کی وفات کے لگ بھگ ختم ہو جاتا ہے۔ اکبر بھی اسی دور میں شامل ہیں۔ یہ قطعات کے انتہائی عروج کا دور ہے۔

چوتھے دور کا آغاز ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ ہوتا ہے اور آج تک جاری ہے۔“ (۲)

حالی نے قطعہ نگاری کی سرزمین میں نئے رجحانات کی تخم پاشی کی۔ ان کے قطعات نے اخلاقی و ملی

مضامین اور سلوہ طرز بیان کی وجہ سے خاصی شہرت حاصل کی۔ ان کا ایک قطعہ ملاحظہ ہو:

غورِ زید کی کرتا ہے گر شکایتِ عمر
تو سمجھو کرتا ہے اپنے غور کا اقرار
جنہوں نے آپ کو سب سے سمجھ لیا ہے بڑا

بڑائی دیکھ نہیں سکتے غیر کی زنیاد (۳)

اکبر اللہ آبادی نے مذہبی، فلسفیانہ، معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی موضوعات پر قطعہ نگاری کی ہے۔

ان کے بعض قطعات میں شوخی، طنز اور طعنت کا پہلو نمایاں ہے۔

اردو قطعہ نگاری کے خدوخال

عموماً چار مصرعوں کی مختصر نظم کو قطعہ کہا جاتا ہے مگر شمیم احمد کے بقول ”بعض اوقات قطعہ دو شعروں سے زائد بھی ہوتا ہے۔ ایسے قطعے کے تمام مصرعے اور اشعار ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں“ (۱)۔ اس کا عموماً دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے لیکن بعض اوقات پہلا مصرع بھی ہم قافیہ ہوتا ہے۔

موجودہ دور میں قطعہ چونکہ زیادہ تر چار مصرعوں کا ہی لکھا جا رہا ہے، اس لیے بعض لوگ اسے غلطی سے رباعی کہہ دیتے ہیں۔ قطعے کا پہلا مصرع دوسرے اور چوتھے مصرعوں سے ہم قافیہ ہونا ضروری نہیں۔ جبکہ رباعی میں یہ تینوں مصرعے لازماً ہم قافیہ ہوتے ہیں۔

غزل کے شعر کی طرح قطعے میں بھی کسی ایک خیال یا جذبے پر جنی مضمون مسلسل بیان کیا جاتا ہے۔ شعراء نے ہر موضوع پر قطعے لکھے ہیں۔ بیشتر قطعات اخلاقی و فلسفیانہ موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ قطعہ عربی زبان کی اصنافِ شعر سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر ایرانیوں نے اس کو اپنایا اور پھر اردو شعراء نے فارسی شعراء کی پیروی کرتے ہوئے اس صنفِ شعر میں طبع آزمائی کی۔

”منصبِ شاعری“ کے عنوان سے ان کا ایک قطعہ دیکھیں:

اثر زیادہ سے زیادہ سماج پہ نثر کی نسبت
اسی لیے ہے نظم شعر و شاعری کی بناء
خلافِ فطرت و انسانیت سے جو مضمون
تو اس میں قوتِ جذبِ قلوبِ خلق کجا

شلو کے قطعات کے بارے میں محمد ذکی الحق کی رائے ملاحظہ ہو:

”شلو جب قطعہ لکھتے ہیں تو خاصا فلسفیانہ اور حکیمانہ لب و لہجہ
اختیار کر لیتے ہیں... سرسید اور حلی نے جس اصلاحی تحریک کی بنیاد
ذالی تھی، شاد عظیم آبادی اس اصلاحی تحریک کے ہم نوا تھے...
۱۸۵۷ء کے بعد شاد پہلے شاعر ہیں جن کے کلام میں فلسفہ عمل کی
تعلیم ملتی ہے۔“ (۷)

علامہ اقبال نے بھی ملی و اخلاقی موضوعات پر قطعے لکھے ہیں۔ یہ قطعات زیادہ تر ان کی کتاب ضربِ کلیم میں موجود ہیں۔ یہ قطعات تقریباً آہنگی اور رفعتِ خیال کے حوالے سے ہماری قومی شاعری کا پیش
بہا سرمایہ ہیں۔

اقبال کے قطعات بھی اکبر الہ آبادی کے قطعات کی طرح کثیر تعداد میں ہیں۔ اگرچہ اکبر اور اقبال
میں خاصا فرق ہے لیکن تقلیدِ مغرب سے نجات، اسلامی اقدار کے احیاء اور جدید تعلیم کی سمیت کے امور
میں دونوں متفق نظر آتے ہیں۔ اس گہری فطری مماثلت کی وجہ سے ہم اکبر کو اقبال کا پیش رو کہہ سکتے
ہیں۔ جس طرح دیگر اصنافِ نظم و نثر میں احمد ندیم قاسمی نے رہنمائی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے اور کسانوں کے
دکھ، سکھ اور زندگی کے مسائل کو مظهرِ عام پر لائے ہیں ویسے ہی ان کے قطعات میں بھی ہمارے مقامی
سماجی اور ثقافتی مظاہر نظر آتے ہیں۔ جمیل ملک کا بیان ہے:

”ندیم نے اپنے قطعات میں مقامی رنگ کے ساتھ فطرت کے مظاہر
'رومان کی جلو توں کسانوں کی زندگی کے چھوٹے بڑے مسائل' ان

اکبر نے ایک ماہر طبیب کی طرح اہل قوم کے عارض کی تحقیق و تشخیص کی اور اپنے کلام کے
ذریعے ان کا علاج تجویز کیا۔ وہ مغربی تہذیب کے ضرر رساں اثرات سے قوم کو بچانا چاہتے تھے۔ وہ
مسلمانوں کی معاشرت، سیاست، تعلیم اور طرزِ حیات کو اسلامی اصولوں کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھنا چاہتے
تھے۔ جذبہ خیر و اصلاح ان کی پوری شاعری پر محیط نظر آتا ہے ہمارے تمام قومی شعراء کے کلام میں یہی
جذبہ کار فرما ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ”شاعری کی رنگ بچ اور خیر ہی کے جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس
کے بعد جو کچھ ہے وہ شاعری کا جسم اور لباس ہے“ (۸)۔ اکبر کو صرف مزاجیہ شاعر سمجھنا غلط ہے صرف
ہنسنا ہنسانا ان کا مقصود نہیں۔ ان کا مقصد و منشاء صرف یہ ہے کہ بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو ان کی گمشدہ منزل
مل جائے۔ ”اکبر کی ظرافت ایک بلند تر معنیٰ نظر کی حامل ہے۔ اس ظرافت کی تہ میں حکیمانہ ڈرف بینی،
عارفانہ نکتہ وری اور سنجیدہ غور و فکر کی لہریں ہیں جو اسے عام ظرافت سے بلند کرتی ہیں۔“ (۹)

اکبر نے اپنا مانی الضمیر و دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ انہیں چونکہ زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے
اس لیے ان کی ظرافت میں نہ صرف الفاظ کا حسن موجود ہے بلکہ انکار کی پختگی بھی بہت کم و کمل نظر آتی
ہے۔ اکبر کے اسلوبِ سخن کے بارے میں آل احمد سرور رقم طراز ہیں:

”اکبر کی ظرافت کا حسن ان کی مرصع کاری، ان کی موزوں
تشبیہات، ان کے قوافی، انگریزی الفاظ کے بر محل استعمال، ان کی
علامات، اساتذہ کے اشعار میں با مزہ تصرف اور ان کے نکھرے اور
ستھرے اسلوب کا مرہون منت ہے۔“ (۱۰)

شاد عظیم آبادی افکار و نظریات کے لحاظ سے اکبر الہ آبادی کے قبیلے کے فرد ہیں۔ ان کے قطعات
میں بھی قومی زبوں حالی کا درد، اصلاحی فکر اور پند و نصائح پر مبنی خیالات ملتے ہیں۔

کے آنسوؤں اور سگراہٹوں کو اس طرح آمیز کیا ہے کہ ندیم کے اپنے گاؤں کے آئینے میں لکب کی پوری معاشرت اور اس کے پیداواری رشتوں کی تصویر کھینچ جاتی ہے۔" (۸)

احسان دانش نے زندگی کے تلخ تجربات کو تھکات کی شکل میں پیش کیا ہے وہ دکھش تشبیہات و استعارات کے ذریعے دینی اقدار اور سماجی حقائق کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ وہ داخلی کیفیات سے زیادہ خارجی مشاہدات کو نوکِ قلم پر لاتے ہیں۔ دیگر قطعہ نگاروں میں اختر انصاری، جوش ملیح آبادی اور رئیس امروہوی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

دورِ حاضر میں قطعہ نگاری کے میدان میں اپنی خدمات کے حوالے سے رئیس ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے تقریباً ہر اہم موضوع پر قطعے لکھے ہیں اور اپنی قادر الکلامی کے جوہر دکھائے ہیں۔

حوالہ جات

- ۱- عظیم احمد، "اصنافِ سخن اور شعری تہمتیں" لاہور: مکتبہ عالیہ اردو بازار، ۱۹۸۳ء، ص ۱۸
- ۲- محمد زکریا، ڈاکٹر، "اکبر الہ آبادی - عقل و تنقیدی مطالعہ" لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۰ء، ص ۳۱۸، ۳۱۹
- ۳- علی، الطاف حسین، "تھکاتِ علی" میرٹھ: انٹرنیٹ القوریہ لال کرتی، سن ندارد، ص ۵۶
- ۴- عبداللہ، ڈاکٹر سید، "اشاراتِ تنقید" لاہور: مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۲۶ء، ص ۳۲۸
- ۵- غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، "نقدِ اکبر" لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۲ء، ص ۲۱
- ۶- آل احمد سرور، "تنقید کیا ہے" کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۲ء، ص ۶۳، ۶۵
- ۷- ذکی الحق، محمد، "ذکر و مطالعہ" پشاور: کتاب منزل، ۱۹۵۹ء، ص ۳۸، ۳۰
- ۸- جمیل ملک، "ندیم کی شاعری - فکر، فن، شخصیت" راولپنڈی: نوید پبلشرز پراپرٹیز سٹریٹ، ۱۹۷۲ء، ص ۲۷

اردو افسانے میں علامت کا استعمال

اردو افسانے کو موجودہ منزل تک پہنچنے کے لئے بہت سے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا ہے۔ بالخصوص علامتی افسانے نے اپنے تاثر آفریں کردار کی وجہ سے قاری پر اپنی شناخت کے انوکھے درواکے ہیں۔

سیدھے سادے انداز میں دوسروں تک اپنے خیالات کی ترسیل ابلاغ کے حوالے سے زیادہ موثر نہیں ہوتی۔ اشارے، کنائے اور علامت کے ذریعے تحریر زیادہ موثر اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ علامتی انداز انسان کے فطری جذبہ تجسس کو ابھارنے اور جذبات کی تسکین کے لئے ہمہ گیر کا کام کرتا ہے۔ روایاتِ صلوات (سچے خواب) کا علامتی اسلوب انسانی ذہن سے قریب تر اور تفہیم مطالب کے لئے موثر ترین ذریعہ ہوتا ہے۔ قدرت ہمیں بعض حوادث سے بچانے کے لئے خوابوں کے ذریعے ہوشیار کرتی ہے تاکہ ہم قتل از وقت کسی ممکنہ پریشانی سے مطلع ہو کر مناسب انداز سے اپنا لائحہ عمل تبدیل کر لیں۔

مثال کے طور پر عالم بیداری میں اگر کوئی دشمن ہمارا تعاقب کرے تو ہم اسے معمولاتِ زندگی کا ایک حصہ سمجھ کر جزوی و سرسری اہمیت دیتے ہیں۔ اگر خواب میں بھی وہی شخص تعاقب کرتا ہوا نظر آئے تو وہ خواب بھی ہمارے معمول کا حصہ ہوگا اور ہم سوچتے ہیں کہ چونکہ بیداری کی حالت میں ہم نے دشمن کو تعاقب کرتے دیکھا ہے، اس لئے وہی خیالات خواب کے روپ میں ذہل کر سامنے آگئے ہیں۔ اس طرح ہم ایسے خواب سے کوئی خاص مفہوم اخذ نہیں کرتے۔ لیکن اگر ہمیں خواب میں کوئی سانپ یا کتا اپنے پیچھے دوڑتا ہوا نظر آئے تو ہم اس سے زیادہ متاثر اور خوف زدہ ہوتے ہیں۔ جب ہمیں اس خواب کی یہ تعبیر بتائی جاتی ہے کہ کوئی دشمن اپنا وار کرنا چاہتا ہے یا کوئی مصیبت آنے والی ہے تو ہم زیادہ ہوشیار اور چوکنے ہو جاتے ہیں۔

قدرت کا یہ علامتی انداز تفہیم چونکہ انسان کے فطری احساسات کا مزاج داں ہے اس لئے سنجیدہ و حساس طبائع اسے جلد قبول لیتی ہیں اور پھر ان اشاراتِ غیب کے اثرات بسرعت معمولاتِ زندگی پر مرتب ہونے لگتے ہیں۔ تخلیق کار شاعر ہو یا نثر نگار اسی رمزیہ و ایمانی اسلوب کو جب اپنی تحریروں میں منعکس کرتا ہے تو وہ زیادہ اثر آفریں، سحر انگیز، دل افروز اور خرد آموز ہو جاتی ہیں۔ جمالیاتی و وجدانی فضا میں تخلیق

ہونے والا ادب روح کی گہرائیوں میں اترنے کی استعداد رکھتا ہے۔

زبان میں روزمرہ، محاورات، ضرب الامثال، تشبیہات، استعاروں اور مجاز مرسل وغیرہ کا استعمال علامت نگاری ہی تو ہے۔ ہم اپنے جذبات و احساسات کو علامت کے ذریعے نمایاں کرتے ہیں۔ مثلاً دل ڈوبنا، دل بیٹھنا، نبض ڈوبنا، سانس اکھڑنا، بلغ بلغ ہونا، آگ جگولہ ہونا وغیرہ۔ علامتی اسلوب میں کیفیات کے موثر اظہار کی یہ چند مثالیں ہیں۔

اس لئے علامتی افسانے کا ادب اور معاشرے کے حوالے سے جائزہ لیں تو ہمیں اس کی افادیت، ضرورت اور اہمیت کا شدت سے احساس ہونے لگتا ہے۔ دیگر اصنافِ ادب کی طرح اگر علامت نگاری کی جمالیاتی توانائی کو افسانہ نگاری میں ڈھنگ سے استعمال کیا جائے تو یہ اس صنفِ سخن کو رفعت آفریں تخلیقی معجزہ بنا سکتی ہے۔

لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ علامتی افسانہ نگاری کے علمبرداروں کی اکثریت نے اردو زبان کے مروجہ سانچوں کی توڑ پھوڑ اور بجز بیان کو کمال ہنر سمجھ لیا۔ اس علامت زدگی سے اردو زبان کے فلک بوس ایوان کھنڈرات میں تبدیل ہونے لگے ہیں۔ دنیا کی کوئی زبان بھی دریائے بیان کی فطری اور قدیم گزرگاہوں پر بند باندھ کر اپنے علمی، فکری اور تخلیقی جوہر کا اظہار نہیں کر سکتی۔

ادب کسی بھی معاشرے کے سیاسی، ثقافتی، مذہبی اور سماجی میلانات کی تصویر کشی کرتا ہے لیکن اگر کسی گروہ کی مقصد کو پورا کرنے کے لئے اسے صرف جنس، بھوک اور ظلم کے پائل اور فرسودہ موضوعات تک محدود کر دیا جائے اور دیگر تمام مسائل کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ بھی تنگ نظری اور خود کو ایک خاص حصار میں مقید کر دینے والا بات ہے۔ جہاں ملوی حجاج انسان کی جسمانی نشوونما کے لئے ضروری ہیں ویسے ہی روحانی ضروریات بھی ایک اٹل حقیقت ہیں۔ اس لئے جہاں انسانی زندگی کے ملوی پہلو ادب کے اہم موضوعات ہیں وہاں اخلاقی اقدار پر مبنی عنوانات بھی ایک ناگزیر ضرورت ہیں۔

آج کا علامتی افسانہ نگار ایک خاص طبقے کا منظور نظر بننے اور شہرت کی دیوی کے حصول کی تمنا میں صداقت، انصاف، نیکی اور دیگر عالی اقدار پر مبنی موضوعات سے دانستہ کنارہ کش ہو گیا ہے۔ حالانکہ وہ خوب جانتا ہے کہ تعصب، حسد، نفرت، انتقام، بد اطواری وغیرہ جسدِ انسانیت کے لئے سنگِ امراض کی حیثیت رکھتے

ہیں۔ ان ہلاکت آفریں ہتھیاروں نے عالمی اقدار کی ترویج کے ارتقائی عمل کو ہولناک انجام سے دوچار کر دیا ہے۔

اس صورت حال میں آج کے بیشتر علامتی افسانہ نگاروں کے لئے ادیب، ادب اور معاشرے کے لئے اپنا یادگار کردار ادا کرنے کی بجائے کنویں کے مینڈک بن کر ایک محدود فضا میں قید ہو چکے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب شکستہ پا زبان اور مفلوج موضوعات کا سہارا لیا جائے گا تو اس کا منطقی نتیجہ یہی نکلے گا کہ ہر علامتی تحریر پیچیدہ ہو کر بے معنویت کا شکار ہو جائے گی اور قاری ابہام کے حاد زاروں میں بھٹک کر منزل سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ آج کے دور میں اگر کوئی افسانہ نگار علامت کے ذریعے زندگی کی کوئی صداقت ہم پر منکشف کرنا چاہتا ہے تو اسے زبان و بیان - دونوں کے حوالے سے ابلاغ کی ضرورتوں کا خیال رکھنا ہوگا اور زندگی کے تمام حقائق کی بغیر کسی مصلحت، منافقت اور تعصب کے عکاسی کرنا ہوگی۔ تاکہ علامت نگاری 'ذہنی پرانندگی' کا باعث بننے کی بجائے فکری شیرازہ بندی کر سکے اور قوم کے اذہن عروج و ارتقاء کی منزل کی طرف گرم سفر ہو سکیں۔

شخصیات

رئیس امر وہوی کے شخصی و فنی کمالات

ممتاز ادیب، شاعر اور صحافی رئیس امر وہوی بیسویں صدی کے اوائل میں شمالی ہند کے قصبے امر وہی کے ایک علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے پردادا، دادا اور والد عمر بھر دامنِ شعر و سخن سے وابستہ رہے۔ رئیس کے والد سید شفیق حسن ایلیا ایک تہذیبی عالم، فلسفی، شاعر اور محقق تھے۔ ”معراجِ نفسِ رسول“ ان کا یادگار شعری مجموعہ ہے۔

جہاں والدین کی تربیت اور گھر کے علمی و ادبی ماحول نے رئیس کی جذباتی و فکری رہنمائی کی وہیں اس دور کے روایتی گھریلو کتب میں ان کے ابتدائی تعلیمی مراحل کی تکمیل ہوئی۔ بعد ازاں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے فنی اور فنی فاضل کے امتحانات بھی پاس کر لیے۔ رئیس حسبِ جوائی کے دور میں داخل ہوئے تو ان کی شعری و ادبی صلاحیتیں بھی منظرِ عام پر آنے لگیں اور ان کے مخفی جوہر نمایاں ہوئے۔ ۱۹۳۳ء کو رئیس کی ان کی پھوپھی زاد بہن ہاشمہ سے شادی ہوئی۔ وہ بیگم سے ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے باوجود عائلی زندگی کے فرائض عمر بھر خوش اسلوبی سے نبھاتے رہے۔ بیگم رئیس کے بطن سے پانچ صاحبزادیاں رحمانہ، صالحہ، شاہانہ، فرزانہ اور خیزران پیدا ہوئیں۔ کوئی فرزند پیدا نہ ہوا۔ رئیس نے گیارہ سال کی عمر میں مندرجہ ذیل اشعار سے شاعری کا آغاز کیا:

جب طبیعت میری گھبراتی ہے
دل وہی کو تیری یاد آتی ہے
دائے حسرت کہ تلاشِ منزل
دربدر ٹھوکریں کھلواتی ہے
یا تو کچھ میں ہی غلط سمجھا ہوں
یا حقیقت میں بہار آئی ہے

رئیس قنبر شاعری میں اپنے والد سید شفیق حسن ایلیا کے شاعر تھے۔ برصغیر کی تقسیم سے قبل انہوں نے کچھ اخبارات و جرائد کی ادارت سے صحافتی سفر شروع کیا اور قیام پاکستان کے بعد کراچی آکر شاعری، ادب، روحانیات اور جنسیات وغیرہ کے حوالے سے ادبی و ادارتی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران ان کے ملی نغمے خاصے مقبول ہوئے۔

تقسیم ہند سے قبل رئیس کی پہلے کانگریس اور پھر مسلم لیگ میں شمولیت نے انہیں سیاسی شعور عطا کیا اور انہوں نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس دور میں ان کا یہ شعر بچے بچے کی زبان پر تھا۔

یاد رکھنا! وقت کا فرمان ٹل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے پاکستان ٹل سکتا نہیں

قیام پاکستان کے بعد بھی رئیس کے سیاسی رہنماؤں سے روابط، احباب، کالم، قطعات، منظومات اور دیگر معمولات ان کی سیاست سے گہری وابستگی کے آئینہ دار ہیں۔

رئیس عمر بھر علمی، ادبی، فلاحی اور سماجی اجماعوں کی سرپرستی کرتے رہے۔ کچھ تعلیمی ادارے بھی ان کی معاونت و مشورت سے قائم ہوئے۔ ان اداروں میں پاک اور نیشنل کالج خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انہوں نے ۱۹۷۳ء میں تحریک و متمول لوگوں کے ملی تعاون سے مہاجرین کے لیے تین رہائشی سکیمیں

بنائیں۔ (۱) رئیس امر وہوی نگر (۲) گلشن رئیس (۳) رئیس امر وہوی ٹاؤن شپ۔

رفیقی کاموں کے ساتھ ساتھ رئیس قطعہ نگاری کے ذریعے عوامی مسائل کو احاطہ تحریر میں لائے۔ اگرچہ انہوں نے ۵ جون ۱۹۴۷ء سے قطعات لکھنے شروع کیے لیکن قیام پاکستان کے بعد ۳۱ جنوری ۱۹۴۸ء سے ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء تک روزنامہ ”جنگ“ کراچی میں سیاسی، سماجی، تاریخی، ثقافتی، مذہبی، اخلاقی اور نفسیاتی موضوعات پر روزانہ ایک قطعہ لکھتے رہے۔ ان قطعات میں بے شبہ پاکستان کی ملی تاریخ نظم کر دی گئی ہے۔

۱۹۸۸ء کے اوائل میں ان کے مداحوں نے پاک ادب سوسائٹی ابو نعیم کے زیر اہتمام ”جشن رئیس“

منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ اس تقریب کا انعقاد جنوری یا فروری ۱۹۸۹ء کو ہونا تھا۔ لیکن ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء کو شقی القلب نے گولی مار کر رئیس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔

راقم الحروف جب رئیس سے ملا تو ان کی شخصیت کی وجاہت سے خاصا متاثر ہوا۔ ان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔ آواز بھاری اور گرج دار، پہلے میں حالات، کشادہ پیشانی، گورا رنگ، دراز قامت، سفید کرت اور کھلی موہری کا پاجامہ زیب تن۔

رئیس ذہنی و جسمانی لحاظ سے بچپن سے عالم پیری تک درست و چست رہے۔ وہ چونکہ علم طب سے واقف تھے۔ اس لیے انہوں نے تمام عمر زہد عادات اور جسمانی تقویٰ کو پیش نظر رکھا۔ وہ خطوں کے جواب اپنے ہاتھوں سے تحریر کیا کرتے۔ صبح سویرے ورزش اور مشق تنفس نور کرنا ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔

وہ رند شرب ہونے کے باوجود عادی رندی کو ہمیشہ معیوب و ضرر رساں کہتے رہے۔ انہوں نے جدید و قدیم علوم کا وسیع مطالعہ کیا تھا۔ اس لیے ان کی نگارشات میں ادبی شکوہ اور علمی وقار نظر آتا ہے۔ انہوں نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ عمر بھر جاری رکھا۔ حلقہ تعارف وسیع ہونے کی وجہ سے ان کی کتب باآسانی فروخت ہو جاتی تھیں۔ مشرقی ماحول میں پیدا ہونے کی وجہ سے رئیس کی شخصیت وسیع النظری، حسن خلق اور کشادہ دلی کے اوصاف سے متصف تھی۔ ان کے چہرے سے اگرچہ ستائش نکلتی تھی لیکن ظریفانہ نکتہ آفرینیوں سے جانِ محفل بنے رہتے تھے۔ ان کے لباس، غذا، انداز و اطوار اور دیگر معمولات زندگی

پر ہمیشہ سادگی و دردیہی کا رنگ غالب رہا۔ اللہ کے بندوں کی دھگیری و دل جوئی کو انہوں نے اپنا مقصدِ حیات بنا لیا تھا۔ چنانچہ نفسیات اور شاعری کے حوالے سے انہوں نے ہزاروں افراد کی رہنمائی کی۔

رئیس کی سیرت میں وہ ہمہ پہلو صفات موجود تھیں جو کسی عظیم شخصیت کی شناخت ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شخصی محاسن اور علمی و ادبی خدمات کو نہ صرف زندگی میں سراہا گیا بلکہ موت کے بعد بھی خراجِ تحسین پیش کیا جا رہا ہے۔ رئیس کی نفسیات 'ادبی نثر' شاعری اور تراجم کے حوالے سے ستائیں کتب طبع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے بعض کتب کئی جلدوں میں ہیں۔ نفسیاتی کتب 'ذہنی و جنسی مسائل' 'مراقبت' 'چنانچہ' 'حاضراتِ ارواح' 'عالمِ برزخ' 'جنات اور نفسیاتی طریقہ ہائے علاج' کے موضوعات پر مبنی ہیں۔ ادبی موضوعات پر مشتمل نثری کتب میں ہمارے معاشرتی و قومی بحرانوں کی شناخت کی گئی ہے۔ انہوں نے شعری مجموعوں میں بیشتر اصنافِ شعر پر طبع آزمائی کی ہے۔ ہندی اور فارسی نثری کتب کے اردو تراجم ان کے مختلف زبانوں پر عبور اور فنِ ترجمہ پر گرفت کو ظاہر کرتے ہیں۔

امروہہ کی ادب پرور نضا، والد کے علمی و روحانی مشاغل اور باطنی علوم کا مطالعہ ایسے عوامل تھے جو رئیس کی علمِ نفسیات سے وابستگی کا باعث بنے اور انہوں نے ۱۹۶۳ء میں ادارہ معن (من عرف نفس) قائم کر دیا جس کا مقصد لوگوں کے نفسیاتی امراض دور کر کے انہیں ذہنی و جسمانی لحاظ سے متوازن سطح پر لانا تھا۔ انہوں نے "جنگ" اور "عالمی ذابجٹ" میں نفسیات و مابعد انفسیات کے موضوع پر ہفتہ وار مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔

چنانچہ بعض نفسیاتی مریضوں نے مراسلت اور بعض نے ملاقاتوں کے ذریعے ان سے ہدایات حاصل کیں۔ رئیس کی بارہ نفسیاتی کتب میں ان مریضوں کے تجربات و مشاہدات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کی نفسیات نگاری اگرچہ علمِ نفسیات کے روایتی معیار پر پوری نہیں اترتی لیکن اپنی افادیت کی وجہ سے نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔

رئیس نے اشتراکیت، رومانیت اور ترقی پسندی کی تحریک کے زمانے میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔

وہ ان سے متاثر ہوئے پر ان میں شامل نہ ہوئے۔ اس کی وجہ گرد و پیش کا وہ ماحول تھا جو ادبی کلاسیکی روایات کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ رئیس کے بیشتر افسانے ایسے ہیں اور معاشرے کے پتے ہوئے مظلوم طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عمدہ کردار نگاری، اثر آفریں مکالمے، ایمائیت، لفظی شکوہ اور فکر انگیز اسلوب ان افسانوں کے اہم خصائص ہیں۔ رئیس کے افسانے تعداد میں کم ہونے کے باوجود اپنی اہمیت اور معیار کی وجہ سے انہیں بطور افسانہ نگار زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

رئیس نے ۱۹۳۰ء سے قیامِ پاکستان تک ڈرامہ نگاری کی۔ ان ڈراموں میں بیشتر ماہنامہ "مسافر" مراد آباد میں شائع ہوئے۔ یہ ڈرامے، چونکہ مشرقی ماحول میں لکھے گئے اس لیے ان میں سماجی روایات اور معاشرتی مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔ رئیس کے ڈراموں کے پلاٹ ترتیب مواد کے اعتبار سے مربوط و منظم ہیں۔ کردار، واقعات اور حادثات تسلسل سے نقطہ عروج کی طرف بڑھتے ہیں اور ڈرامائی کیفیت پیدا کر کے قاری کو متحیر کر دیتے ہیں۔ رئیس غیر ضروری سنسنی پیدا کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اسی لیے ڈرامے کا انجام بھی پیش آمدہ حالات و واقعات کا منطقی نتیجہ ہوتا ہے۔ عمدہ زبان و بیانیہ نے مکالموں میں تاثیر و عمل کا افسوں پھونک دیا ہے۔ "شکستِ ناز" روشنی، آپ کی مرضی اور "گلاب کا پھول" کا رئیس کے بہترین ڈراموں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

رئیس کے طنزیہ مضامین زیادہ تر سماجی ناہمواریوں، شخصیات، معاشرتی روایات اور انسانی رویوں سے متعلق ہیں۔ ان کی علامتی اسلوب کی سادہ و پرکار تحریروں میں طنز کا ایک مخصوص انداز ملتا ہے۔ ان کا تخلیقی کردار "نواب اچھے مرزا" ایک ایسا جاندار کردار ہے جس نے طنز و مزاح کے روپ میں معاشرتی محائب اور موجودہ سیاست کی خامیوں کو بڑے فنکارانہ انداز سے بے نقاب کیا ہے۔

رئیس کے ادبی مضامین میں عصری تقاضوں، اردو اصنافِ نثر، علمی و ادبی شخصیات اور ادبی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ نثر پارے با محاورہ زبان، سادگی، بیانیہ، اثر انگیزی، رمزیت و اشاری اسلوب، نظم و ضبط اور پختہ افکار کے حوالے سے اردو نثر میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

ان کے تنقیدی مضامین میں 'شعریت'، 'علیت اور فنی بصیرت' نمایاں ہے۔ وہ موضوع سے قبل اس کا پس منظر واضح کرتے ہیں۔ ان کے بعض مضامین کے تمہیدی حصوں کی غیر ضروری طوالت نے تحریروں کو متوازن نہیں رہنے دیا۔ رئیس تنقیری اصطلاحات اس سلیقے سے استعمال کرتے ہیں کہ قاری کو مفہوم سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

رئیس نے ۱۹۳۰ء میں صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ میر دور سیاسی 'سامی اور ادبی تحریکوں کے لحاظ سے انقلاب انگیز و ہنگامہ پرور تھا۔ وہ اسی دور میں ادارت و اداریہ نویسی کے حوالے سے صحافت سے وابستہ ہوئے۔ وہ ماہنامہ "مسافر" مراد آباد اور کراچی کے ہفت روزوں "غالب" اور "شیراز" میں مدیر و اداریہ نویس کے طور پر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ان کے اداروں کے بیشتر موضوعات ملکی و بین الاقوامی حالات، سماجی مسائل، مصنوعات، نئی تصنیفات اور دو خانوں کے تعارف پر مشتمل ہیں۔ رئیس کی صحافتی تحریروں میں 'سیاسی'، 'سامی'، 'ثقافتی'، 'ادبی'، 'نفسیاتی اور روحانی موضوعات' پر مبنی ہیں۔ انہوں نے عمر بھر اپنے مضامین اور کالموں میں قومی مسائل، سیاسی حالات اور مشرقی اقدار کی پامالی کو موضوعِ سخن بنایا اور کبھی سنجیدہ اور کبھی طنز و مزاح کے روپ میں کھل کر اظہارِ خیال کرتے رہے۔ رئیس نے عام آدمی کے مصائب کو اربابِ اقتدار تک پہنچانا اپنا اولیٰ فرض سمجھا۔ وہ روزنامہ "جنگ" اور دیگر رسائل کے کالموں اور مضامین کے ذریعے اس قلمی جہاد میں تاحیات مصروف رہے۔

رئیس کے نفسیاتی مضامین زیادہ تر نفسیاتی مریضوں کے خطوط کے جائزوں پر مشتمل ہیں۔ ان جائزوں میں وہ مسائل کی نوعیت اور اسباب کے بارے میں مدلل بحث کر کے علاج تجویز کرتے ہیں۔ جو مضامین اس انداز سے ہٹ کر لکھے گئے ہیں ان میں محققانہ رنگ نمایاں ہے۔ ان نفسیاتی مضامین پر علیت کے ساتھ ساتھ ادبیت کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔

رئیس کے خطوط ہمیں ان کی جذباتی و نفسیاتی کیفیات، عادات و اطوار اور خیالات و عقائد سے آگاہ کرتے ہیں۔ انہوں نے زندگی میں اندازاً دو لاکھ خطوط لکھے۔ چونکہ ان کے حلقہٴ تعارف میں کئی نسل

مذہب، 'زبان'، 'فرقے اور پیشے کے لوگ شامل تھے اس لیے خطوط کی یہ کثیر تعداد باعثِ حیرت نہیں۔ مرزا غالب کی طرح ان کے خطوط میں بھی علالت و ضعفِ پیری کا بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے سفارشی خطوط میں مختصر لوگوں کو ضرورت مندوں کی امداد کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ مکاتیبِ رئیس میں مہاجرین، بنگلہ دیش اور بہاریوں کے بے آسرا خاندانوں کی بحالی و آباد کاری کی تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ رئیس کو اپنی گونا گوں مصروفیات کی وجہ سے مکتوبات میں علمی و ادبی مباحث پیش کرنے کا بہت کم موقع ملا ہے۔ ان کے بعض خطوط میں زندہ دلی، 'ثقافت مزاجی'، 'شوخی اور طراقت کے نمونے بھی موجود ہیں۔ رئیس کو رمزد ایماء کے پردے میں داخلی و خارجی حالات کی عکاسی کرنے میں کمال حاصل ہے۔ وہ غیر ضروری لفاظی سے پرہیز کرتے ہیں اور سادہ و مختصر جملوں میں اپنا مدعا ظاہر کر دیتے ہیں۔ عوامی رابطے کے حوالے سے رئیس کے مکتوبات، 'قلم مکتوب نگاری کی انوکھی مثال ہیں۔

رئیس نے نثر کی طرح شاعری میں بھی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا۔ وہ اگرچہ شاعری میں اپنے والد کے شاگرد تھے لیکن جوش ملیح آبادی اور جگر مراد آبادی سے بھی متاثر تھے۔ ان کے موروثی ادبی خصائص، مطالبے اور شعری صلاحیتوں نے یکجا ہو کر سب سے پہلے غزل کے کوچے میں قدم رکھا۔ ۱۹۳۱ء میں ان کی پہلی غزل منظرِ عام پر آئی۔ اس کا مطلع دیکھیں:

قصہ نہ پوچھ مجھ سے شبِ انتظار کا

ہر اشک آئینہ ہے میرے حالِ زار کا

رئیس نے غزل کو قدیم روایات اور مخصوص موضوعات تک محدود نہیں رکھا بلکہ ندرتِ تخیل سے اسے نیا رنگ عطا کیا، جس میں روایتی تجربہ، 'حسن و عشق'، 'کاکل و رخسار'، 'وصل و فراق اور آہ و فغاں کے ساتھ ان کے اپنے عہد کے سماجی، 'عمرانی'، 'معاشی'، 'تہذیبی اور فکری رویے موجود نظر آتے ہیں۔ غمِ جاہل ہو یا غمِ دوراں، ان کے اشعار میں تنزل کی روح رواں دواں نظر آتی ہے۔ رئیس کے طنزیہ اشعار میں گہرائی، 'وسعت'، 'فکر انگیزی'، 'شوخی اور متانت کے عناصر نمایاں ہیں۔ ان کے نفسیاتی اشعار کرب

یہ دعا مانگتے ہیں شام و سحر
اے خدائے بزرگ اے داور
اے خداوندِ انفس و آفاق
زہرِ آفات کو بنا تریاق

جلوہِ عارضِ نبی رشکِ بتلِ یوسفی
بیند بسیند سر بہ سر چہرہ بہ چہرہ ہو بہو

اے حسین! اے وقت کی تاریکیوں میں شمعِ نور
اے حسین! اے سردی طاقت کے نورانی ظہور
تیرا ذکرِ اسلام کی روحِ رواں ہے آج بھی
تیرا غم تاریخ کی نبضِ تپاں ہے آج بھی

رئیس کی ملی نظموں کا آغاز تحریکِ پاکستان سے ہوا۔ بعد ازاں ان کا یہ سلسلہ سخن عمر بھر جاری رہا۔ انہوں نے ان نظموں میں ایک طرف تو قاصدِ اعظم، لیاقت علی خاں، نظامہ اقبال اور دیگر مشاہیرِ علم و ادب کے کارنامے بیان کر کے انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور دوسری طرف معاشرے کے تلخ اور سنگین حقائق کو بے نقاب کیا ہے۔ ان کی فلسفیانہ و نفسیاتی منظومات اگرچہ انکار کے حوالے سے افشار اور بے ترتیبی کا شکار نہیں لیکن یہ منظومات جب رمز و تشبیہ اسلوب کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں تو ابہام و بے معنویت کو جنم دیتی ہیں۔ مجموعی طور پر رئیس کی ملی نظمیں سماجی شعور اور تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت اور دورِ جدید کے مسائل کی خوبصورت عکاسی کرتی ہیں۔ اسلوب کے لحاظ سے یہ نظمیں ندرتِ قوالی، خوبصورت تشبیہات و استعاراتِ روانی و بے ساختگی اور چست بندشوں کی وجہ سے ان کے کلام کا

جذبات، ذہنی اضطراب اور خیالات کے فشار کی عکاسی کرتے ہیں۔ غم انگیز کیفیات کی عکاسی کے ساتھ انہوں نے اردو غزل کو برجائیت سے معمور انکار دے کر عزم و عمل کی توانائی بھی عطا کی ہے۔ رئیس کے اشعار میں تلاش و جستجو کے ذریعے حقیقتِ گل کو پالینے کی شدید آرزو نظر آتی ہے۔ عقلیت پسندی کے باوجود تذبذب اور تشکیک نے ان کے بعض اشعار کو مبہم بنا دیا ہے۔

تکرارِ لفظی، فلسفیانہ اسلوب، پلور تشبیہات کے استعمال اور شائستہ و شستہ زبان کے حوالے سے رئیس کی غزل ان کی انفرادیتِ فکر اور کمالِ فن کا ثبوت ہے۔ ان کی غزلیات کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یوں لگا بیٹے کہ مل کھا کے دستکِ نوت گئی
اس نے وقفہ جو لیا ناز سے انگریزی میں

گردشِ وقت بھی آگے مجھے لے جانے سکی
تم جہاں جموڑ گئے تھے میں وہیں ہوں اب تک

خاموش زندگی جو بسر کر رہے ہیں ہم
گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم

بے ذوقِ حیات جی رہا ہوں
سقراط ہوں زہر پی رہا ہوں

رئیس نے نظم گوئی سے بھی خاصی شہرت پائی ہے۔ انکے والد چونکہ دینی و اصلاحی نظمیں لکھتے تھے۔ اس لیے رئیس پر بھی ان کے فکری اثرات ہوئے اور انہوں نے حمد، نعت اور منقبت کو دیدہ اظہار بنایا۔ ان کا یہ کلام رفعتِ مضامین اور عمدگی اسلوب کا حسین امتزاج ہے۔ نمونے اشعار دیکھیں:

تکسار ہیں۔ نمر نے کے طور پر نہیں کے چند اصلاحی اشعار ملاحظہ ہوں:

قرآن کے مطالب سینوں میں ہیں ہمارے
ہم اس کے ترجموں ہیں وہ ترجموں ہمارا
بزمِ ازل میں ہم نے وحدت کے گیت گائے
طوبیٰ کی ڈالیوں پر تھا آسٹیل ہمارا
بور و احد سے ظاہر اپنی شجاعتیں ہیں
خیبر سے جا کے پوچھو نام و نشان ہمارا

اگرچہ کلامِ رئیس پر تفکر و تعقل کا رنگ محیط ہے اور وہ عقل کی بلا دستی کے قائل ہیں لیکن ان کی رومانی نظموں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ انسانی جذبات کی ضرورت و اہمیت سے بھی ناغہ نہیں۔ انہوں نے اختر شیرانی کے تتبع میں اپنی تخیلاتی محبوبوں سلمیٰ، ریحانہ اور غدرا سے معاملاتِ حسن و عشق کے رنگا رنگ موضوعات نظم کیے ہیں۔ ان موضوعات میں عشق، جذبات نگاری، وصل، راز و نیاز، سراپا نگاری اور منظر نگاری ان کی فنی ریاضت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ رئیس کے سوزِ عشق سے معمور غم انگیز اشعار رُلا تے اور تڑپاتے نہیں بلکہ دل میں ہلکی سی ککب پیدا کر دیتے ہیں۔ خصوصاً جذبہ و فکر کا استخراج رئیس کی نظموں کی شناخت ہے۔ عشقیہ جذبات اور فکر انگیز میلانات نے ان رومانی نظموں کو دھوپ چھاؤں کے منظر کی طرح دل آرا و نظرنواز کر دیا ہے۔ رئیس فلسفیوں کی طرح حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے سوچتے ہیں کہ محبت میں ناکامی کے اسباب کیا ہیں؟ محبوب مجھ سے گریزاں کیوں ہے؟ گوہر مقصود کیسے حاصل ہو گا؟ اس استفہامیہ و مکالماتی انداز نے کلامِ رئیس میں گہری معنویت پیدا کر دی ہے۔ مرصع زبانی اور صنائع و بدائع کے بر محل استعمال نے کلمنوی شعراء کی یاد تازہ کر دی ہے۔ علاوہ ازیں تاثر آفرینی، سرمستی و وارفتگی، جمالیاتی عنصر، تسلسل اور عمدہ تراکیب سے رئیس کی رومانی نظمیں لطیف و شیریں ہو گئی ہیں۔

کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

گزرتا ہے کبھی جب چودھویں کا چاند بدلی سے
ہمیں آنچل میں ان کا روئے تابی یاد آتا ہے
اندھیری رات میں جگنو چمکتے ہیں تو رہ رہ کر
دوپٹے کے ستاروں کا چراغ یاد آتا ہے
کلی کو پھول بنتے دیکھ کر عہدِ بہاراں میں
کوئی چہرہ بست نوخیز و خنداں یاد آتا ہے

مخصوص موضوعات کے علاوہ دیگر عام موضوعات پر بھی رئیس نے خاصی نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں میں بھی انہوں نے زبان و بیانیہ کے جلوے دکھا کر اپنا معیار و وقار برقرار رکھا ہے۔

رئیس کی شاعری کا ایب اہم پہلو ان کی قطعہ نگاری ہے۔ اس صنف سے فطری مناسبت ہونے کی وجہ سے انہوں نے اس میں قدرتِ زبان و بیانیہ کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ انہوں نے ان قطععات میں تصغیر کے سیاسی واقعات محفوظ کر دیے ہیں۔ یہ قطععات قیامِ پاکستان سے قبل انگریزوں اور ہندوؤں کی سازشوں، مسلمانوں کی آزادی کے لیے پُرجوش کوششوں، ۱۹۴۷ء کے خونیں فسادات میں لاکھوں انسانوں کے قتل عام اور قیامِ پاکستان کے بعد مہاجرین کے مسائل، سیاسی صورتِ حال اور قومی حوادث کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔ ہر دور میں رئیس کے خلاقانہ و بصیرت یافتہ ذہن پر پاکستان کے مجموعی حالات اثر انداز ہوتے رہے ہیں اور وہ اپنے توہم عمل کو قطععات کی صورت میں قلم بند کرتے رہے ہیں۔ ان کے قطععات ملک کے معاشی، معاشرتی اور تہذیبی حالات کا وہ آئینہ ہیں جس میں متوسط طبقے کی مادی و ذہنی زبوں حالی کے خدوخل نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ قطععات کا مجموعی اسلوب طنز و مزاح، تسلسل اور سادگی و پرکاری کا عجائب کدہ ہے۔ رئیس نے قطعہ نگاری کی فنی روایات کی پابندی کے ساتھ نئے تجربات بھی کیے ہیں۔ ان کے قطععات میں انوکھے توانی، تکرارِ لفظی، ہم صوتی الفاظ، ذر معنی الفاظ، لفظی مماثلت، تکرارِ حرف اور اردو انگریزی اضافی عناصر ہیں جو ان کے تکنیکی اجتہاد کو ظاہر کرتے ہیں۔ چند قطععات درج ذیل ہیں۔

تو نے بخشا سینہ مردم کو وہ سوز و گداز
بن گیا عزمِ بشر قسمت گر و تاریخ ساز
تیری یاد آزاد بندوں کا سہارا بن گئی
کربلا سرداگی کا استعارہ بن گئی

رئیس کے سلاموں میں شہیدانِ کربلا کے مصائب کا درد ناک انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے
ترنیہ اشعار جذبات نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ انہوں نے رمز و ایما کے پردے میں واقعاتِ کربلا کے نقوش
ابگر کر کے قہقہہ خوش سلیقگی کا ثبوت دیا ہے۔ تسلسل، شستہ و فصیح زبان کے استعمال اور پُر تاثیر اسلوب
کے اعتبار سے رئیس کے سلام ان کی ایک اچھے سلام نگار ہونے کی دلیل ہیں۔ سلاموں کے اشعار کا نمونہ
دیکھیں:

فقط اک تشنہ لب کے واسطے امداد کے لشکر سے
وہ پیہم تیر کی بارش وہ تلواروں کی جھنکاریں
وہ جذبہ اللہ اللہ کربلا والوں کا وہ جذبہ
تن زخمی سے ان کے خون کی بہتی دھاریں

رئیس نے تمہیدیہ اور مدحیہ دونوں اقسام کے قصائد لکھ کر متقدمین کی قصیدہ نگاری کی روایت کو
ذمہ رکھا ہے۔ انہوں نے سیاسی و ملی شخصیات مثلاً قائد اعظم اور لیاقت علی خان کو بھی قصائد میں خراج
تعمین پیش کیا ہے اور ہماری ملکی سیاست کے نشیب و فراز پر بھی اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے۔
رئیس نے طنزگوئی کے ذریعے قومی و معاشرتی مسائل کے اسباب سے پردہ اٹھا کر حقیقی صورتِ حال واضح کی
ہے۔ مظاہرِ فطرت کے بارے میں ان کے قصائد محاکات کی رنگینہوں، مؤثر الفاظ و تراکیب اور جدت
تخیل کے محاسن سے آراستہ ہیں۔ وہ کبھی تشبیہ، کبھی گریز اور کبھی مدح کے حصے میں پند و نصح کے
ظہر اشعار پیش کر کے ہمارے قلبی ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلامی تلواروں کے موضوع پر

لفظ کشمیر و جونا گڑھ کی بربادی کا ماتم کیا
نہ جانے اور ابھی کس کس کی شامت آنے والی ہے
دکن کی سرزمین پر بھارتی افواج کے ہاتھوں
قیامت آچکی ہے یا قیامت آنے والی ہے

کیوں جبینِ زندگی خم ہو کسی کے سامنے
سرخوں کب تک غرورِ خواجگی کے سامنے
بیچ ہے ہر کفر اس شرکِ جلی کے سامنے
آدی سجدہ کرے اور آدی کے سامنے

شاہِ عشری، قائد اعظم اور محافلِ قصیدہ خوانی نے رئیس کو مرثیہ نگاری کی طرف راغب کیا
ان کے ہمہ رنگ مزاج کا بھی یہی تقاضا تھا کہ وہ اس ہمہ جہت صنفِ شعر کے ذریعے تخلیقی صلاحیتیں منظر
عام پر لائیں۔ ان کے مرثیوں میں ترنیہ جذبات کا منکرانہ اظہار پایا جاتا ہے۔ میدانِ کربلا میں آلِ رسول
کے یزیدی فوج سے شجاعانہ مقابلے کی داخلی و خارجی تصویر کشی ان کی محاکات نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔
ساختگی، تاثر آفریں لہجے اور عالمانہ الفاظ و تراکیب نے ان کے مرثیوں کو منفرد اسلوب عطا کیا ہے۔ ہیئت کے
حوالے سے اگرچہ انہوں نے قدیم مرثیہ نگاروں کی پیروی نہیں کی لیکن تخیل کی بلندی، قدرتِ کلام اور
مفکرانہ اسلوب کے اعتبار سے ان کے مرثیے دیگر شعرا کے مرثیوں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ رئیس کے
ایک مرثیے "اے حسین" کا ایک بند ملاحظہ ہو:

آدمیت کو تری شانِ جواں مردی پہ ناز
عالمِ انسانیت کو تیرے دم سے امتیاز

ان کے قصائد بصیرت افزا و فکر انگیز ہیں۔ بعض قدیم قصیدہ نگاروں کی طرح رئیس نے اپنے قصائد کو غیر ضروری لفظی بازیگری سے بھرا، ٹپٹل اور مہمل نہیں کیا۔ عربی، فارسی، انگریزی اور ہندی الفاظ بکثرت استعمال کرنے کے بلوجوہ انہوں نے کام کو الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں بنایا۔ رئیس نے سبڈل و سوقیانہ انداز سے قصائد کو محفوظ رکھا ہے۔ انہوں نے مرزا سودا کی طرح کٹھن اور سنگلاخ زمینوں میں قصائد لکھے ہیں اور مشکل قوافی استعمال کیے ہیں۔ رئیس کے قصائد خوبصورت تشبیہات و استعارات، لفظی مرتع کارپوں، تازگی بیاں، توازن و تناسب، فصاحت اور نکتہ آفرینی کے اعتبار سے دنیائے قصیدہ نگاری میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ”قصیدہ نعت“ رئیس کے فنی محاسن کا شاہکار ہے۔ اس قصیدے کے مدح کے حصے میں وہ نبی اکرمؐ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جو ممدوحِ خدائے دو جہاں ہو
لکھوں توصیف میں اس کی قصیدہ؟
خوش اے میرے نطق تا مرتب
خجل اے میری فکرِ نارسیدہ
نظامِ فکر ہو یا نظمِ اخلاق
اسی صانع کے سب نقش کشیدہ
مثل جس کا کردارِ گرامی
نمونہ جسکے اوصافِ حمیدہ

قصائد کی طرح رئیس کی مثنویاں بھی قدرتِ زبان و بیاں اور فنی پختگی کے جواہر سے مالا مال ہیں۔ انہوں نے اپنی مثنویوں کو قدامت و متوشین اساتذہ کی طرح موضوعاتِ حسن و عشق کے اظہار کا وسیلہ بنانے کی بجائے عصرِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا ہے اور رئیس ایک نمایاں مثنوی نگار کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ قیامِ پاکستان کا پس منظر و پیش منظر، سیاست کے مدوجزر، سیاسی رہنماؤں کا کردار اور اہم

ملکی واقعات رئیس کی مثنویوں کے اہم موضوعات ہیں۔

وہ چونکہ تحریک و تخلیق پاکستان کے یحییٰ شاہد ہیں اور سیاسی جماعتوں میں خود بھی شامل رہے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اپنی مثنویوں میں قومی رہنماؤں کی مساعی کو پرجوش اور دلہانہ انداز میں سراہا ہے۔ ان رہنماؤں میں قائد اعظم، خواجہ ناظم الدین اور لیاقت علی خاں سرفہرست ہیں۔ محسنین قوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ وہ خود غرض سیاست دانوں کے عیوب بھی منظر عام پر لاتے ہیں اور بے جھجک طنز کے نشتر چلاتے ہیں۔ رئیس کی بعض مثنویاں معاشرے کے اس مظلوم و مجبور طبقے کے مسائل کی نشاندہی کرتی ہیں جو بنیادی سہولتوں سے محروم ہو کر کس پھری کے عالم میں زندگی گزار رہا ہے۔ ان کی کچھ مثنویاں ایسی بھی ہیں جن میں انہوں نے کراچی کے مشاہدات و تاثرات پیش کیے ہیں۔ موسمی کیفیات کے بیان میں ان کے اشعار شوخی و طرافت سے معمور ہیں۔ قدیم اساتذہ سخن کی طرح انہوں نے اکثر مثنویوں کی ابتداء سلقی ناموں سے کی ہے۔ رئیس کی اکثر مثنویوں میں بحر متقارب مشن مقصور و محذوف (فعلون فعلون فعلون فعلون) استعمال کی گئی ہے۔ انہوں نے قدیم مثنوی نگاروں کے مقرر کردہ اوزان کی پیروی کی ہے۔ ایمینیت و اشاریت، آرائش لفظی، پختہ و شیریں تراکیب، تسلسل، وضاحت بیاں اور جنیات نگاری کی خصوصیات نے رئیس کی مثنویوں کو اسلوب کی حسن کاری عطا کی ہے۔ لالہ صحرا اور جشنِ عید ان کی عمدہ مثنویاں ہیں۔

نمونہ اشعار دیکھیں:

مجھے ساقیا بکر وہ بوتلِ الاث
کہ زہار کو ڈانٹ دے جسکی ڈاٹ
وہ بوتل کہ جس میں وزارتِ امیر
جسے پی کے بن جاؤں میں بھی وزیر
وہ بوتل کہ نشہ ہو جس کا قوی
جسے پی کے سوجھے فقط لہندی

بچے نیت اگر پائے نگہ می لرزد
 ہر کجا می نگرم دیدہ تر در پیش است
 پایہ گل از اثر گریز یاراں کشیم
 بگذر آہستہ کہ خون تابہ کمر در پیش است

رئیس کی فارسی شاعری سبک بندی میں ہے اور تازگئی فکر اور فنی ایج کے اعتبار سے انفرادی شان رکھتی ہے۔

بچے ان بزرگوں کی ساقی قسم
 کہ جن کا عقیرہ ہے دام و درم

فارسی زبان سے مناسبت کی وجہ سے رئیس نے فارسی شاعری کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کی فارسی منظومات، غزلیات، نعتیں اور مستقبلیں ان کی اردو شاعری کی طرح ہمہ رنگ و ہمہ جہت ہیں۔ سربراہان ممالک، دوستوں اور بزرگوں کے بارے میں ان کی فارسی منظومات تاثر آفرینی، قدرتِ کلام، شوخی اور نکتہ سنجی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ معاملاتِ حسن و عشق اور درد و الم کے موضوعات پر صدیوں سے فارسی شعراء طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ رئیس نے اپنے کلام میں حسن و جمل کی داستانیں بھی رقم کی ہیں اور عشقِ خانہ خراب کی آشفٹ سری کا حال بھی لکھا ہے۔ ناامد اقبال کی معروف اردو نظم ”شکوہ و جوابِ شکوہ“ کا با محاورہ فارسی ترجمہ رئیس کی فارسی زبان اور فنِ ترجمہ پر گرفت کا ایک اہم ثبوت ہے۔ انہوں نے اکثر قدیم فارسی شعراء کے کلام کا مطالعہ کیا تھا۔ اسی وجہ سے فارسی کی قدیم کلاسیکی روایات ان کے مزاج میں رچ بس گئی تھیں۔ انہوں نے اسلوبِ کلام کی عمارت و دلکش تشبیہات و استعارات، خوبصورت تراکیب، لفظی شان و شوکت اور شوخی پر استوار کر کے فارسی شاعری میں اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

آنچه از عشق و وفا آموخیم
 از حسین کریم آموخیم
 عظمتِ حق از حسین کریم است
 کاروانِ سلار مردانِ خداست

شہاب دہلوی کی غزل کے عناصر ترکیبی

جناب شہاب دہلوی کی خدمات جہاں ایک ادیب، صحافی، نقاد اور محقق کی حیثیت سے ناقابل فراموش ہیں وہاں بہاول پور کے ایک کہنہ مشق اور ممتاز شاعر ہونے کے حوالے سے وہ سخنوروں میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا حیرت انگیز اور دیگر کلام بھی اگرچہ خاصا معیاری ہے تاہم وہ بنیادی طور پر ایک غزل گو شاعر ہیں۔

اردو غزل اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے ہر دور میں مقبول عوام و خواص رہی ہے۔ شعراء نے اسے داخلی و خارجی تجربات و مشاہدات کے اظہار کا ذریعہ بنا کر انسانی انگلیوں کا ترجمان بنادیا۔ ہر شاعر نے اس گل سدا بہار کی خون دل سے آبیاری کی اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جسے سب سے زیادہ پذیرائی حاصل ہے۔ ہر غزل گو شاعر نے اس میں خوبصورت اضافے کئے ہیں اور اب یہ صنف شاعری تیزی سے اپنی منزل ارتقاء کی طرف گرم سفر ہے۔

جناب شہاب دہلوی کی غزل میں تغزل کے وہ تمام اجزاء نظر آتے ہیں جو غزل کا طرہ امتیاز ہیں۔ رمز و کنایہ اور اشاریت کا غزل کے بنیادی عناصر میں شمار ہوتا ہے۔ شہاب دہلوی کی غزل میں ہم یہ عناصر بدرجہ اتم دیکھتے ہیں۔ انہوں نے کم سے کم الفاظ استعمال کر کے وسیع مفہیم کو غزل میں سمویا ہے۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

یا مجھ سے میری حسرت نظارہ چھین لو
یا وہ نظر بھی دو کہ تم آؤ نظر مجھے

درد و غم لازمہ حیات ہیں۔ انسان روز ازل سے دکھ درد کی بھیٹی میں جتا رہا ہے۔ اس سے کسی انسان کو مفر نہیں۔ مختلف شعراء نے مختلف انداز سے احساس الم کو شعروں کا روپ دیا ہے۔ شہاب صاحب کا انداز ملاحظہ ہو۔

میری زندگی کی ہے روداد کیا
الم، درد، آشفتگی اور بس

ہجوم غم میں گرفتار آدی ہے بہت
سودا حشر تو کیا اپنی زندگی ہے بہت

وہ غم کو زندگی کا ایک ناگزیر حصہ سمجھتے ہیں اور اسے ایک مسلہ حقیقت کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ وہ صبر و استقامت سے زندگی کی راہوں پر رواں دواں رہنا چاہتے ہیں اور رنج و غم کا شکار ہو کر بھی خود کو مایوسی و ناامیدی کے بحر بے کراں میں غرق نہیں ہونے دیتے۔ ان کی رجائیت پسندی ایک حوصلہ آفریں پیغام بن کر امیدوں کے چراغ سینوں میں روشن کر دیتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہمیں نامرادی کا طعن نہ دیجئے ہم آلام کو بھی سمجھتے ہیں راحت
اگر ہم گلست وفا بن لیتے ہمارے لیوں پر تبسم نہ ہوتا

حلوٹے کیا کیا نہ آئے زندگانی میں شہاب
یہ الگ ہے ہم رہے کانٹوں میں پھولوں کی طرح

شہاب دہلوی کی غزل داخلی جذبات و احساسات کا حسین مرقع ہے۔ اس کے بلوغت بدلتے ہوئے حالات پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ اس دور منافقت میں کبھی اہل سیاست پر طنز کے نشتر چلاتے ہیں اور کبھی دوستوں کی بے رخی و بے مہربانی کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔ اشعار کے تیور دیکھیں۔

پھول ہوں پائل، کانٹے زینت دستار ہوں
کس نے ڈالی ہے چمن میں ان اصولوں کی طرح

دوستی کا بھی ہے موسم سے تعلق شاید
رت بدلتی ہے تو کیوں لوگ بدل جاتے ہیں

کانتوں پہ بہار کا عمل ہے
بھولوں نے بدل لئے ہیں چولے

ہر دور میں ہوا ہے گلستاں خزاں سپرد
ہر دور میں بہار کو سمجھا گیا درست

معاملات حسن و عشق شعرا کے محبوب موضوعات رہے ہیں۔ شباب نے بھی حسن کی حشر سائنوں
اور عشق کی وارداتوں کو موضوعِ سخن بنایا ہے لیکن ان کی غزل کی خوبی یہ ہے کہ اشعار میں کہیں ابتذال اور
سلیحت کا رنگ نظر نہیں آتا۔ نمونہ کلام پیش خدمت ہے۔

ہم نے اپنے عشق سے رتبہ بڑھایا حسن کا
جس حسین کو ہم نے چاہا رونقِ مہکنا بنا

نگاہ شوق ترے حسن کے نظارے کو
زمانے بھر کی نگاہوں سے روشنی مانگے

جب تجھے سامنے رکھ کر میں غزل لکھتا ہوں
لفظ کاغذ پہ ستاروں میں بدل جاتے ہیں

جا پہنچے جہاں پہ حسن دیکھا
یہ دل ہیں کہ ہیں اڑن کھٹولے

جناب شباب دہلوی چونکہ خود ایک راسخ العقیدہ مسلمان اور ایک شریف النفس انسان ہیں۔ اس
لئے ان کے انکار پر ہمیں تصوف کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ صوفیانہ رنگ نے ان کی غزل کو چار چاند لگا
دیئے ہیں۔

رنگِ سخن دیکھیں

ۛ

نصیب دولت و ثروت بھی عزو جاہ بھی ہے
مگر یہ کیسے سکون دل و نگاہ بھی ہے
انسان عمر بھر عمدہ و منصب اور مال و زر کے حصول کے لئے تنگ و دو کرتا ہے اور جب وہ اپنے
مقاصد میں کامیاب ہو جاتا ہے تو موت اس کے درحیات پر دستک دینے لگتی ہے۔ اس وقت انسان کی
بے چارگی اور افسوسناک حالت دیدنی ہوتی ہے۔ شباب صاحب کا اس کیفیت میں ڈوبا ہوا ایک شعر پیش
خدمت ہے۔

ۛ

نور شیدِ جردانی ذوب گیا اور شام کا ہنگام آ بھی گیا
ہم زیت کی حسرت کرتے رہے اور موت کا پیغام آ بھی گیا
آج کا انسان اپنی آنکھوں پر حرص کی پٹی باندھ کر اپنے ہی اپنائے جنس کا گلا کٹنے میں مصروف
ہے۔ سوچوں کا معیار پست ہو گیا ہے اور انسان روحِ انسانیت سے بیگانہ ہو گیا ہے۔ شباب دہلوی کا فکر انگیز
شعر ملاحظہ ہو۔

عارف رحمانی کے فکری زاویے

جناب عارف رحمانی شعراء کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو شاعری میں کلاسیکی روایات کا پاسدار اور زندگی کے شائستہ رویوں کا امین ہے۔ آج کے دور کی شاعری کا بیشتر حصہ قواعد زباں سے عاری اور مضمون سے یکسر خالی ہے۔ ہم نموداریت پسندی نے قوم کے قیمتی اذہن کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔

قسط الرجال کے اس دور میں عارف رحمانی جیسے شعراء کا دم غنیمت ہے جنہوں نے قدیم شعری روایات کے ورثے سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ ”حسن گل“ ان کی قلور انکلاہی اور مہارت فن کا منہ بولنا ثبوت ہے۔

جب انسان حوادث زمانہ کی زد میں آتا ہے اور حالات کے نشیب و فراز اسے پریشانی سے دوچار کرتے ہیں تو اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اسے گرداب بلا سے نکالے۔ اس کی دستگیری کرے۔ اس کے مسائل حل کرے۔ اسے صعوبات و مشکلات کی دلدل سے نکل کر مسرتوں سے ہم کنار کرے۔ اس وقت صرف خدائے واحد کی ذات ہی اسے اپنی معاون و مددگار نظر آتی ہے اور کون ہے جو منزل مقصود پر پہنچائے۔

بقول عارف رحمانی

ۛ

جب رہ ہستی کے بیچ و خم نے بھٹکایا مجھے
رہبری کے واسطے تیرا تصور آ گیا

سینہ ڈوب گیا تیرے جب لب ساحل
پتہ چلا کہ خدا کیا ہے ناخدا کیا ہے

جب اہتر حالات میں خداوند تعالیٰ کو یاد کیا جاتا ہے اور وہ اپنے مجبور بندے کی پکار سن کر اس کی مصیبتیں دور کر دیتا ہے تو بندے کا خدا کی ذات پر یقین پختہ ہو جاتا ہے۔ پھر وہ ہر مقام پر اپنے منتہائے مقصود پر نظر رکھتا ہے۔ بقول عارف

اب آدھی کو نظر آدمی نہیں آتا
چراغ نگر جلاؤ کہ تیرگی ہے بہت

شباب دہلوی کی غزل میں پاکیزگی، وقار اور سادگی ہے۔ انہوں نے رندی و ہوس ناکی اور جذباتی و سطحی مضامین سے ہمیشہ اجتناب کیا اور اعلیٰ و مثبت افکار کے موتیوں سے دامن غزل کو ملامل کر دیا۔

میرا گھر ہو، تیری مسجد ہو کہ ہو صحن حرم

میں جہاں سجدہ کسوں حاصل سجدہ تو ہے

جب یہ دعویٰ کیا جائے کہ رب جلیل کی ذات عالی ہی محور مرکز ہے تو ظاہری وابستگی کے ساتھ ساتھ باطنی تعلق کو بھی مستحکم و پائیدار کرنا چاہئے۔ تاکہ جس بات کا زبان اقرار کرے، دل بھی اس کی گواہی دے۔

دل میں بھی تو پنہاں ہو کوئی داغ محبت

سجدوں کے نشاں ہی کو تو ایماں نہیں کہتے

حق گوئی اللہ والوں کا شعار رہا ہے۔ جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے والا بخوبی جانتا ہے کہ اس کے لئے جرات و بے باکی اور ایمان کی پختگی کی ضرورت ہے۔ داعی حق کو صرف رضائے الہی مطلوب ہوتی ہے، لوگوں کی رضامندی یا خفگی اس کے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔

کوئی سچ بات کہہ گیا عارف

ساری دنیا خفا سی لگتی ہے

مردان حق پر جب بھی ابتلا و آزمائش کی گھڑی آئی تو وہ بے خطر آگ میں کود گئے۔ ان کے یقین کا لہر انہیں نصرت حق کی صورت میں نصیب ہوا۔ نار، گلزار میں تبدیل ہو گئی۔

آئی جب سخت گھڑی حق کے پرستاروں پر

پھول کھلتے ہوئے دیکھے گئے انگاروں پر

راہ حق پر چلنے کے لئے تزکیہ نفس بہت ضروری ہے۔ بغض، کدورت، رشک اور حسد کی آلائشوں سے دامن دل کو پاک و صاف کئے بغیر رضائے الہی کی منزل حاصل نہیں ہو سکتی۔

اس وقت تک ظاہری احوال کی درستی سود مند ثابت نہیں ہو سکتی جب تک باطن میں نفسانیت کے بھڑکتے ہوئے شعلے ٹھنڈے نہ ہوں۔

چلتے گھر کی آگ تو عارف لوگ بجھا ہی دیتے ہیں

دل سے لیکن رشک و حسد کی آگ بجھانا مشکل ہے

موجودہ دور میں خود غرضی اور بے حسی نے ایثار، ہمدردی اور انسان دوستی کے جذباتوں سے دلوں کو یکسر خالی کر دیا ہے۔ اس صورت حال میں جب مادی آسائشات کے حصول کی دوز میں ہر شخص دوسرے سے آگے نکل جانے کی فکر میں مبتلا ہو، مجبوروں کی فریاد کون سنے؟ سب کچھ دیکھتے اور سنتے ہوئے بھی لوگ اندھے اور بہرے بن کر غریبوں اور مظلوموں کے مسائل کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ۛ

دکھلائیں گے بہاوی دل اور کس سے یہاں فریاد کریں

یہ شر ہے اندھوں، بہروں کا چل اور گھر آباد کریں

کچھ لوگ اپنی مطلب براری کے لئے دوسروں کو دھوکہ دینا بھی جائز سمجھتے ہیں لیکن کچھ لوگ فریب کھا کر بھی دوستانہ تعلقات قائم رکھتے ہیں۔

دوستی میں فریب کھانا ہی

حاصل دوستی سمجھتا ہوں

دنیا دوستی کے لازوال رشتے کی قدر شناس نہیں اور ہر شخص کی دوسرے کی جیب پر نظر لگی ہے۔ اہل وفا اس وقت دوستوں کے اصلی چہرے کو پہچانتے ہیں جب ان کا سب کچھ ٹٹ پکا ہوتا ہے۔ عارف رحمانی نے اس سنگین حقیقت کو کتنی خوبصورتی سے شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے۔

من کی قدر نہ جانے کوئی دھمن کے سب دیوانے ہیں

سب کچھ بھینٹ چڑھا کر ہم بس دنیا کو پہچانتے ہیں

اس دور ہوس میں نام نمدو محبان وطن نہ صرف غیروں بلکہ اپنوں کو بھی مختلف خیالوں اور بہانوں سے لوٹنے میں مصروف ہیں۔

یہ دور ہوس تو بہ اس دور میں روزانہ
لٹنے ہوئے دیکھا ہے گلشن ہو کہ ویرانہ

بانٹ لیتے ہیں جو آپس میں دہن کے نکلے
ہم نے ایسے بھی مچھان دہن دیکھے ہیں

عارف رحمانی کی شاعری میں غم جاناں کا سوز و گداز بھی اپنی ارفع شکل میں موجود ہے اور غم دوراں
کی کرب ناکی بھی مکمل پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ اگرچہ بعض اوقات درد و غم کی کنگ چرخ کی صورت بھی
اختیار کر لیتی ہے تاہم عارف رحمانی غم و اندوہ کو ایک حقیقت سمجھتے ہوئے بھی اسے زندگی پر طمانی نہیں
ہونے دیتے۔ ان کا غم بھی رجحیت آلود ہے۔ وہ مایوسی و قنوطیت کے شاعر نہیں۔ وہ دکھوں کی شمشیر براں کے
وار سے کرب بھی مسکرانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

نوک مڑگاں تک آیا جو احساس غم
اشک بن کر وہ رشک مگر ہو گیا

اشک آتے ہیں تو ہنس دیتا ہوں فطرت کے خلاف
دیکھ کتنا پاس آداب وفا رکھتا ہوں میں

معنی سمجھ کے صبر و سکون و قرار کے
بوسے لئے ہیں دل نے غم روزگار کے

میں کیوں غم اٹھاتا میں کیوں رنج ستا
اگر ان سے حاصل مسرت نہ ہوتی

کتاب

Kitaabiyat.blog

”قانون مکافات“ ایک منفرد علمی سوغات

تفکر و تعقل، اشرف المخلوقات۔ حضرت انسان کا وہ پر عظمت و شوکت خاصہ ہے جو اسے کہہ ارض پر بسنے والی تمام ذی روح مخلوق سے ممتاز کرتا ہے۔

خلقت کائنات کے ابتدائی دور سے عصر تازہ کے لمحات موجود تک ادیب، شاعر، مصلح، فلسفی، سائنسدان اور دیگر علوم و فنون سے وابستہ اشخاص زندگی اور کائنات کے تہ در تہ اسرار کی عقدہ کشائی کے نئے نئے پیمانے تلاش کرتے رہے ہیں اور حیات و کائنات کے باہمی ربط کی کھوج میں سرگرداں رہے ہیں۔ ادباء و شعراء نے اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے حقائق و معارف کے خدوخل پچانے کی کوشش کی ہے اور فکر و خیال کے جلال پھینک کر مخفی رموز کو اپنے احاطہ گرفت میں لاتے رہے ہیں۔

ان کے علاوہ اہل فکر و نظر کا ایک خاص الخاص گروہ بھی ابتدا ہی سے سرگرم عمل رہا ہے۔ جس نے ادیان عالم، بصیرت یاب دانش وروں کے صالح تفکر اور زیرک فلسفیوں کے دلائل و براہین کی بنیادوں پر اپنے افکار کے پر شکوہ ایوان تعمیر کئے۔

مرزا انور بھی ایسی ہی محدودے چند شخصیات میں سے ہیں جن کے ذہن رسالے طویل عرصے تک اہل دانش کے علمی ذخیرے سے اکتساب فیض کیا۔ ان گراں بہا موتیوں کی مالا۔۔ اور گلمائے رنگا رنگ کا گلدستہ ”قانون مکافات“ اہل علم و فن کے لئے ایک ایسی منفرد کتاب ہے جو انہماں کی نجر کھینچیوں کے لئے یقیناً ابر بہار ثابت ہوگی۔

یہ کتاب ان کی برسوں کی ریاضت کا ثمر، عمیق مطالعے کا نچوڑ اور تجربات و مشاہدات کا حاصل ہے۔ کتاب کا نام اس کے موضوعات کا نمائندہ ہے۔ ”قانون مکافات“ میں عمل اور اس کے منطقی رد عمل کی فطری و قدرتی تصویر کشی کی گئی ہے۔

اس کتاب میں انسان کی خداداد بے پایاں صلاحیتوں، منعم حقیقی کے انعامات کے جزائوں، انسان کی ناشکر گزاری، حیات چند روزہ کے دوران اندھی خواہشوں کی تکمیل میں انسان کا مجتہانہ کردار اور عبرت گاہ عالم کے دلدوز واقعات کی تفصیل نہایت موثر اور دل نشیں انداز میں بیان کی گئی ہے۔

۹۵ ”موج نور“ کا تجزیاتی مطالعہ

ہر دور میں عظیم و باکمال شخصیات نے سیاسی، ثقافتی، دینی، علمی، ادبی اور دیگر حوالوں سے کارہائے نمایاں سرانجام دے کر بہاول پور کی شناخت کو معتبر کرنے کے لئے بے مثال کردار ادا کیا ہے۔

ان شخصیات میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں جنہوں نے اسی دھرتی کی آغوش میں جنم لیا اور کچھ ایسے ہیں جو مختلف علاقوں سے یہاں آکر آباد ہوئے۔ جناب سید مسعود حسن شہاب دہلوی کا تعلق موخر الذکر افراد سے ہے۔ انہوں نے دہلی سے ترک سکونت کر کے بہاول پور میں مستقل رہائش اختیار کی۔ بطور ادیب، شاعر، صحافی، مورخ اور محقق انہوں نے جو شاندار خدمات سرانجام دیں، ناقابل فراموش اور باعث فخر و اعزاز ہیں۔

ان کی ہمہ پہلو و ہمہ اوصاف شخصیت نے ہر میدان میں اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ بالخصوص چہستان شعروادب میں انہوں نے جو سدا بہار پھول کھلائے، ان کی خوشبو تدویر ذہنوں کو معطر رکھے گی۔ مختلف اصناف شعر پر ان کی یکساں دسترس، ان کی قلور الکلامی اور مہارت فن کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔ حمد ہو یا نعت، غزل ہو یا نظم، مرفیہ ہو یا قصیدہ، شہاب دہلوی کا قلم ہر صنف شعر کے میدان میں یکساں رواں دواں نظر آتا ہے۔

کسی تخلیق کار کو اس کی تخلیق سے جدا کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ فنکار کی شخصیت کی پرچائیاں اس کے فن پاروں میں رونما ہو کر اس کے فکری خدوخل کا آئینہ بن جاتی ہیں اور اسی طرح اگر کسی کے مضمی کلمات کو جانچنے اور پرکھنے کی خواہش ہو تو اس کے فن کا درجہ کھول کر اس کے کردار کے ہر شوخ اور دھندلے منظر سے جان بچاؤ کی جاتی ہے۔

شہاب مرحوم صوم صلواتہ کے پابند، راہباز اور نیک سیرت انسان تھے۔ ان کے دیگر کلام میں ان کے پاکیزہ افکار جس طرح ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں، ویسے ہی ان کا حمدیہ و نعتیہ کلام ان کے اسلامی خیالات کا منظر ہے۔ شہاب دہلوی کو بزرگن دین اور صوفیائے گرام سے گہری عقیدت تھی۔ اس عقیدت نے ان کی زندگی کے ہر گوشے پر امنٹ اثرات چھوڑے۔ ان کا اخبار ”الہام“ ان کے نظریات، معتقدات اور دیگر فکری جتنوں کی بھرپور غمازی کرتا ہے۔ ان کی صوفیانہ و عارفانہ سوچوں کا دھارا ان کی ہر تحریر میں موجزن

”قانون مکافات“ کا آغاز قرآن پب و انجیل مقدس کی آیات کے تراجم سے کیا گیا ہے۔ جو بلاشبہ ایک مستحسن روایت ہے۔ بعد ازاں علامہ اقبال رضوی، قائد اعظم رضوی، نمنشے اور برناڈشا کے عارفانہ و پر حکمت اقوال شامل کتاب کر کے مصنف نے ایمان افروز و بصیرت انگیز نفا قائم کی ہے۔ زیادہ تر ایسے موضوعات احاطہ تحریر میں لائے گئے ہیں جو ہماری معاشرتی و سماجی زندگی کے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر مسئلے کا تجزیہ کرنے سے پہلے مصنف کے ذہن میں یہ سوالات موجود رہے ہیں کہ مسئلہ کیا ہے؟ یہ کیوں پیدا ہوا ہے؟ اور اسے کیسے حل کیا جاسکتا ہے؟ مرزا انور نے بڑی شرف نگاہی اور باریک بینی سے زندگی کے حقائق کا مشاہدہ کیا ہے اور انہیں بڑی شائستگی و عمدگی سے، منظر قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ ایسے موضوعات پر لکھنے والے اہل قلم عموماً علمی اصطلاحات سے اپنی تحریر کو بوجھل اور ثقیل کر دیتے ہیں جس سے عام قاری کو اس کی تفہیم میں دشواری محسوس ہوتی ہے اور اس طرح اس کی افادیت کم ہو جاتی ہے۔ مرزا انور کی تحریر کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ سادہ سل اور رواں اسلوب کی حامل ہے۔ الفاظ کا انتخاب نہایت سلیقے سے کیا گیا ہے۔ کہیں کوئی لفظ بے موقع استعمال نہیں کیا گیا۔ ہر جملہ نہایت برجستہ و بر محل ہے۔ غیر ضروری طوالت اور بے جا الفاہی کہیں نظر نہیں آتی۔ تحریر میں اختصار کے ساتھ ساتھ جامعیت و پرکاری بھی عروج پر نظر آتی ہے۔ مصنف نے زندگی آمیز و زندگی آموز افکار کے قیمتی خزانے کتابی شکل میں محفوظ کر دیئے ہیں۔ مرزا انور صرف حقائق کے سمندر کی سطح کا منظر ہی نہیں دیکھتے اور نہ فقط ساحل پر بکھری ہوئی سیپیاں ہی ان کے مشاہدے کا ہدف ہیں بلکہ وہ اس کے اندر جھانک کر زیریں لہروں کے تہوج کا نظارہ کرتے ہیں اور طوفانوں کی ہر آہٹ کو ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں۔ ان کی غوطہ زنی کا نتیجہ پوشیدہ رموز کے گہرائے آبدار کی رونمائی کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔

نفسیاتی عوامل کی فلسفیانہ توجیہ و تشریح کے لئے غیر معمولی ذکاوت و بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مرزا انور کو قدرت کی طرف سے گہرائیوں میں اتر کر تجزیہ کرنے کی صلاحیت ودیعت کی گئی ہے۔ مجموعہ مضامین ”قانون مکافات“ اہل فکر و نظر کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ فکری انحطاط کے اس دور میں ایسی کتب کی ملک و قوم کو اشد ضرورت ہے تاکہ مسلمانوں کے دلوں میں اپنی گم گشتہ میراث کے تحفظ کا احساس پیدا ہو اور اقوام عالم میں اپنا زوال پذیر تشخص بھل کر سکیں۔

تیری قدرت سے روز و شب کا ظہور
 ہر نظارے میں رونما تو ہے
 بحر و بر ہوں کہ آسمان و زمین
 ہر طرف تو ہے جا بجا تو ہے
 ہے مناظر میں تیرا عکس جمل
 سب میں رہ کر بھی ملوری تو ہے

انسان جب اپنی احتیاجات کا رخ دنیا کی طرف کرتا ہے تو وہ اس سے گہری توقعات وابستہ کر لیتا ہے
 لیکن جب بے مہری و بے رخی کے پتھروں سے دنیا اس کا آئینہ خواہشات چور چور کرتی ہے تو اسے احساس ہوتا
 ہے کہ دست سوال دراز کر کے اس نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ جو خود محتاج ہو وہ دوسرے کی احتیاج کیا
 پوری کرے گا۔ یہ سوچ کر انسان اس عظیم ہستی کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس کی بارگاہ آخری جائے اماں
 ہے۔ بقول شہاب دہلوی

تجھ سے رحم و کرم کی سب کو امید
 سر بر بخشش و عطا تو ہے
 جس کے در پر شہاب دے دستک
 ہے ساروں کا آسرا تو ہے

تو کہ ستار بھی، نظار بھی، رحمان بھی ہے
 تیرے الطاف و عنایت کی کوئی حد ہی نہیں
 تو جو چاہے تو سفینے کو کنار اٹل جائے
 تو اگر چاہے تو پائے دل مضطر تسکین

حضور ﷺ کی محبت کو جب تک جزو ایمان نہ سمجھا جائے، معرفت خداوند قدوس کا حصول مشکل
 ہے۔ اس نکتہ لطیف کو شہاب دہلوی منکشف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

دکھائی دیتا ہے۔ شہاب دہلوی کی دیگر کتب کی طرح ان کا شعری مجموعہ ”موج نور“ ان کی دین سے گہری وابستگی
 کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ ”موج نور“ جہاں شہاب دہلوی کی فنی عظمتوں کی ایک موثر دلیل ہے وہاں یہ مرحوم
 کے لئے آخرت کا سرمایہ بھی ہے۔

عقیدتوں کا یہ پیش ہمانذرانہ حمدوں، نعتوں، سلاموں، قصائد اور مرثیوں پر مشتمل ہے۔

”موج نور“ میں اسرار معرفت الہی بھی ہیں اور سب رسول ﷺ کے انمول تلمینے بھی جلوہ نشاں
 ہیں۔ اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے معروف سخنور سید ہاشم رضا نے اپنے آثارات کو منظوم شکل میں
 پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

یہ صرف شعر نہیں معرفت کے ساغر ہیں

جو چاہے آئے بھرے دل کے آئینوں کو

”موج نور“ کے آغاز میں جناب سید ہاشم رضا نے اپنے مضمون میں ریاست بہاول پور میں اپنے
 قیام کے دوران کچھ واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے جناب شہاب سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے منتخب
 کلام کے کچھ نمونے پیش کئے ہیں۔ ”برسبیل تذکرہ“ کے عنوان سے شہاب دہلوی نے اپنے شعری مجموعے
 کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”زیر نظر مجموعہ انہی پاک ہستیوں کے فضائل و مناقب میں نعت و قصائد، سلام و

منقبت اور مرثیوں پر مشتمل ہے، جس سے مقصود اظہار کمال نہیں بلکہ اظہار

عقیدت و سپاس ہے۔ میں نے تو شہ آخرت کے طور پر انہیں مرتب کر کے شائع

کرنے کا اہتمام کیا ہے اور اللہ رب العزت کی شان کرم سے یہ امید رکھتا ہوں کہ

وہ بہ طفیل محمد ﷺ میرے اس حقیر نذرانے کو شرف قبولیت سے نوازے گا۔“

کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے خالق کی صفت خالقیت کی گواہی دے رہا ہے۔ سورج، چاند، ستارے،

جگل، پہاڑ، وادیاں، صحرا — تمام مظاہر فطرت صانع دوعالم کی کارگیری کے شہکار ہیں۔ چشم بیجا ہر منظر میں

رب ذوالجلال کی قدرت کے جلوے دیکھ لیتی ہے۔ بقول حضرت شہاب دہلوی

کیوں نہ اس کے آستاں پر ہم جہیں سائی کریں
جس کی خاک پا کے ذرے عرش پجائی کریں

جنہیں حضور ﷺ کی غلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے، سلاطین جہاں کے تاج و تخت ان کے قدموں
کی خاک بن جاتے ہیں۔ بارہ عشق نبیؐ میں سرشار غلامان محمد ﷺ پوریا نشین ہوتے ہوئے بھی آسمانی رفعتوں
سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ وہ زمین پر رہ کر بھی نظارہ افلاک کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

شہابِ دہلوی فرماتے ہیں۔

عجب تھی بارہ عشق نبیؐ کی سرخوشی
رہے زمین پہ ہم لیکن آسمان کی طرح
غلام ہم بھی ہیں ان کے بلال کی صورت
ہمارے دل کی بھی ہیں دھڑکنیں ازاں کی طرح

حادثات و مصائب کی آندھیاں جب دلوں کے چمن زاروں کو تاخت و تاراج کرتی ہیں۔ جب
طوفان مصائب کشتی حیات کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے تو شفیع المذنبین، رحمتہ العالمین محمد ﷺ بے اختیار یاد
آتے ہیں۔ شہابِ دہلوی نے امت مسلمہ کے مصائب و مسائل کا موثر الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے۔ ان کی ایک
نعتیہ لقمہ کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

ہر شخص ہے حیران و پریشان و دل افکار
موجیں ہیں بلاخیز، قیامت کا ہے منجدھار
ماحول موافق ہے نہ قابو میں ہے پتوار
امت کا سفینہ ہے مصائب میں گرفتار
یاسید الابرار

بیداد کے بھگڑ ہیں تھمیزے ہیں ستم کے
روکے سے بھی رکتے نہیں طوفانِ الم کے
محتاج ہیں ہم آپ کی اب چشمِ کرم کے
اب کشتی امت کو اشارے سے کریں پار
یاسید الابرار

حضرت علیؑ کی خدمت میں شہابِ دہلوی کا ہدیہ عقیدت ملاحظہ فرمائیں۔

وہ بابِ علم بھی ہے، علم کا خزینہ بھی
وہ مر ختمِ نبوت کا ہے عین بھی
وہ اوجِ ملتِ اسلام کا ہے زینہ بھی
ملا ہے دل بھی محمدؐ سے اس کا سینہ بھی
ہے بوئے عشقِ محمدؐ سے تر پینہ بھی
وہ جس طرف سے بھی گزرا وہی منک آئی

شہیدِ کربلا، نواسہِ رسول، جگر گوشہ، بتولِ حضرت امام حسینؑ کے بارے میں حضرت محمد ﷺ نے

فرمایا تھا کہ حسین منیٰ و انا من الحسین
جناب شہاب کے سلام کے دو بند دیکھیں

نہ سرکنا تے تو اسلام کس طرح پچتا
رضا خدا کی حقیقت میں تھی رضائے حسینؑ
شریکِ کرب در بلا سارا خاندان ہوا
اس امتحان کی کے تپ تھی سوائے حسینؑ
شہابِ ذوقِ عمل کی فطرت ضرورت ہے
جہیں دہر پہ روشن ہیں نقشِ پائے حسینؑ

جعفر بلوچ کی دو اہم تصنیفات کا مختصر جائزہ اقلیم

حسینؑ عزم کی تصویر، پاسبان حرم
حسینؑ ممبر کا پتلا، حریف جاہ و حشم
حسینؑ علم کا پیکر، حسینؑ تیج و دم

ہیں۔ جناب جعفر بلوچ کا نام محتاج تعارف نہیں۔ وہ ایک عرصے سے سرزمین سخن میں تھم پاشی کر رہے

”اقلیم“ ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ اس مجموعے کی ابتدا میں ”اتھمار تشکر“ کے عنوان سے جناب جعفر بلوچ کی چند سطور شائع کی گئی ہیں۔ بعد ازاں ”جعفر بلوچ - دیار ادب کا ایک نیا ریا“ کے عنوان سے پروفیسر صابر لودھی کا ایک پر مغز مضمون شامل کتاب ہے۔ صاحب کتاب کے بارے میں پروفیسر تحسین فراقی کا مضمون ”جعفر بلوچ اور ابن کارنگ سخن“ بھی خاصا وقیع اور جاندار ہے۔ اس مضمون میں تحسین صاحب نے سوانحی پس منظر میں جناب جعفر بلوچ کے فنی خود خال اجاگر کئے ہیں۔ حمد و نعت کے بعد غزلیات و منظومات شریک اشاعت ہیں۔ قلیپ میں محترم ڈاکٹر سید عبداللہ رقم طراز ہیں۔

”جعفر بلوچ کا دیوان شعر کہ اسے اقلیم معنی کیسے ہر صنف پر مشتمل ہے۔ غزل،

نظم، قطع، نعت و منقبت ہر صنف میں خوب لکھا ہے اور دوسرے شعرائے عصر

سے الگ، انوکھا لکھا ہے۔ تازگی، توانائی، قوت، حرارت اس میں سب کچھ ہے۔

شکوہ و شکایت، غم و شادی، سماجی اور معاشرتی حقیقتیں بڑے سیکھے انداز میں

بیان کی ہیں۔“

نائبینٹل کے دوسرے اندرونی صفحے پر جناب جعفر بلوچ کی تصویر اور مختصر کوائف درج ہیں۔ جعفر بلوچ شعراء کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو زندگی کی معنوی صداقتوں اور آفاقی قدروں پر پختہ یقین رکھتا ہے۔ پیش نظر اردو شعری مجموعہ ”اقلیم“ ان کے طویل شعری سفر اور فنی ریاضت کا عکاس ہے۔ ”اقلیم“ میں شامل غزلیات و منظومات اپنے طنزیہ اسلوب، رمز و ایحاء، شدت احساس اور ندرت فکر کی وجہ سے جناب جعفر بلوچ کی انفرادیت کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔ اعلیٰ روایات سے استفادہ اور جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرنا جعفر صاحب کا نصب العین ہے۔ ان کا ذوق سلیم عامیانہ سطح سے دور ہے۔ سچائی، انصاف، نیکی، شرافت

اور شائستگی ان کے نظریہ حیات کے اہم عناصر ہیں۔ جعفر بلوچ اپنے نظریہ فن کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

تاکم رہیں گے موقف تقدیس فن پہ ہم
بے شک جاں فریفتہ اہنڈال ہو

کتاب کے آخر میں شامل منظومات ”تحسین باشناس“ ”روح اقبال کا احتجاج“ ”آپ کے شرکی کیا روایات ہیں“ حقائق کی انوکھے انداز میں نقاب کشائی کرتی ہیں۔ ان نظموں میں طنز و تعریض کا عنصر نمایاں ہے۔ لہجے کا کنیلا پن جو جعفر بلوچ کا امتیازی وصف ہے، ان نظموں میں تمام نکال دکھائی دیتا ہے۔ ”اقلیم“ سے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

کیا سمجھے گا ہم خاک نشینوں کے مسائل
دیکھا نہیں جس نے ہمیں مند سے اتر کر

زشت رو توڑتے ہیں آئینے
تینوں کی ہنسی نہیں جاتی

آدمیت پر تصرف ہو گیا ابلیس کا
شیخ جی نور و بشر پر بحث فرماتے رہے

اس لئے میری غزل میں ہیں کنایات و رموز
مجھ کو سچ بھی بولنا ہے اور خوف جاں بھی ہے

اپنے چروں کے داغ دھو نہ سکے
آئینوں پر برس رہے ہیں لوگ
آیات اوب

جناب جعفر بلوچ کی کتاب ”آیات اوب“ لینے اور مظفر گڑھ کے شعراء کا تذکرہ ہے۔ اس سے قبل ان کی متعدد تحقیقی کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔ ”آیات اوب“ میں جعفر بلوچ ایسے معروف و غیر معروف شعراء کو منظر عام پر لائے ہیں، جن کی نگارشات اگرچہ نہایت بلند مرتبہ و قائل قدر ہیں لیکن ادبی مراکز سے دور ہونے کی وجہ سے ان کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی، جس کے وہ حقدار تھے۔ جن عظیم شخصیات کے چہرے وقت کی دبیز کمر میں چھپ گئے تھے، جعفر صاحب کی اس گرانمایہ کتاب کے ذریعے پھر نمایاں ہو گئے ہیں۔

بقول پروفیسر محمد منور

”جعفر بلوچ نے آیات اوب مرتب فرمائی اور اس طرح ہمیں بہت سے باکمال شعراء اور اہل قلم سے آگاہ ہونے کا موقع فراہم کیا۔ ہمیں معلوم ہے کہ بڑے شہروں یا بڑے علمی مراکز سے دور بھی بڑے باکمال لوگ ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے وہ صحراؤں کے پھول اپنے ارد گرد خوشبو پھیلاتے رہتے ہیں اور مرکز میں نہ ہونے کی وجہ سے ان کی شعائیں، خوشبوئیں اور ان کا فیض دور دور تک نہ پہنچتا۔“

اس تذکرے میں لینے اور مظفر گڑھ کے تقریباً تمام قائل ذکر شعراء کو نمائندگی دی گئی ہے۔ چند اہم شخصیات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

حضرت ذکریا ملتانوی بیٹھو، حضرت عبدالعزیز پر بیاروی بیٹھو، فتح محمد کلاچی، فرمان پٹیالوی، ذاکر جگرانوی، راجہ محمد عبداللہ نیاز، نواب جلال میرزا خانی، کشفی ملتانوی، خلیق ملتانوی، شارق انبالوی، ذاکر مہر عبدالحق، نواب زاہد نصر اللہ خان ناصر، ارمان عثمانی، عیاض سونی پتی، نسیم لہ، خیال امرہوی، غافل کرناہی، اختر جعفری، عدیم صراطی، جعفر

بلوچ، شہباز نقوی وغیرہ

جعفر بلوچ صاحب نے یہ تذکرہ مرتب کرتے ہوئے معتدل، محتاط اور غیر جانبدارانہ انداز اختیار کیا ہے۔ انہوں نے شعراء کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ البتہ کلام شعراء کی خصوصیات اجاگر کرتے ہوئے غیر ضروری مدح و ستائش سے گریز کیا ہے۔ یہ ان کی متوازن سوچ کی علامت ہے۔

”آیات ادب“ میں شعراء کے مختصر سوانحی حالات بیان کئے گئے ہیں اور ان کے مخصوص رنگ و خم کی نشان دہی کی گئی ہے۔ جعفر بلوچ صاحب نے اس تذکرے میں بہت شائستہ اور خوبصورت زبان استعمال کی ہے۔ اس کا اسلوب نہایت دلپذیر ہے۔ ہر سطر پڑھتے ہوئے قاری کے ذہن میں شعراء کی شخصیات کے خدو خال واضح سے واضح تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جعفر بلوچ نے شعراء کرام کے نمونہ کلام کا انتخاب بھی بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ حشو و زوائد کو چھوڑ کر اہم اور نمائندہ کلام کو ہی زینت قرطاس بنایا گیا ہے۔

۲۴۰ صفحات پر مشتمل یہ تذکرہ مرتب کر کے جہاں جعفر بلوچ صاحب نے ہماری قاتل فخر علمی و ادبی شخصیات کو قہر گمناہی سے نکالا ہے وہاں علم و ادب کے شائقین پر بھی احسان عظیم کیا ہے۔ ان کا یہ کارنامہ ادبی حلقوں میں یقیناً استہسان کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ آج ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جن سے ہم اپنے عظیم اسلاف کی مساعی سے روشناس ہو سکیں۔ وہ اسلاف جن کے چہرے زمانے کی گرد میں بھپ گئے ہیں۔